ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

OCTOBER - 1987

حیاتِ نو

ابو البیان حماد

عالم میں پھیل جائیگی جب دینِ حق کی ضو	ہو گی طلوع امن و محبت کی صبحِ نو
تسکین کہاں ہے راہ نوردانِ شوق کو	یہ جستجو تیز، یہ تگ و تازِ گریز و دو
ظلمت شبِ حیات کی سر پیٹنے لگی	مدت کے بعد شکر ہے، لو پھٹ گئی ہے پو
نیکی کا پھل سزا نہ بدی کا صلہ جزا	کس طرح تخم نیم سے پیدا ہو فصلِ جو
کمی ضرور، ملتِ بیضاء میں ہے ابھی	لیکن یہ شرط ہے مرے ساتھی اسے ہو
ہر گز جزائے خیر نہیں دس پہ منحصر	اخلاص ہو تو ایک کی ملتی ہے سات سو
بس اس کی فکر ہے کہ یہ دیا کہاں بجھے	ہر سمت چل پڑی ہے برائی کی ایک رو
باطل کے سر پہ بھوت تشدد کا ہے سوار	اوہام بت نئے ہیں، خرافات تو بتو
پھونکے گا خرمنِ خس و خاشاکِ کفر کو	اسلام کے نظام مبارک کا سیلِ نو
فکر و نظر میں آتا ہے جس وقت انقلاب	پتھروں میں پھوٹتی ہے شعاعِ حیاتِ نو

حماد پہ ہے بارشِ الہام کا نزول

آتے ہیں ذہن میں جو خیالاتِ نو بنو

....

انشاء اللہ

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا چوتھا

دو سالہ اجلاس

۱۲ر ۱۳ر ۱۴ر فروری سنہ ۱۹۸۸ء کو

مادر علمی جامعۃ الفلاح میں منعقد ہو رہا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۲ —— شمارہ نمبر ۱۰

اکتوبر سنہ ۱۹۸۷ء

● مدیر منتظم —— نور محمد فلاحی

● مدیر —— طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سالانہ زر تعاون	۳۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
فی شمارہ	۲ روپے

پتہ ترسیل زر کا: دفتر ماہنامہ مجلّہ حیاتِ نو - جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

انصاف نیمی پریس برائے جمال پریس دہلی —— کاتب: رفیق احمد، شاہپور، کنڈھرپور، اعظم گڑھ

فہرست حیاتِ نو

اداریہ
بھارت کے مسلم طلبہ اور نوجوان دوراہے پر — ایڈیٹر — ۳

بحث و نظر
نظم اور درس سالی کا مفہوم (مولانا کی اپنی تحریر) — مولانا جلیل احسن ندویؒ — ۶

مقالات
[illegible] — مولانا سید احمد عروج قادری — ۹
معاشرتی مسائل سے تعرض — عبید اللہ فہد فلاحی — ۱۸
نبی کریمؐ کا نظریہ اخلاق — مکی حسن فلاحی — ۳۲

شخصیات
ماہر القادری — عہد پرور زندگی — قابلِ رشک موت — سید سعد گیلانی — ۴۲

عظمت کے مینار
ام المومنین حضرت ام سلمہؓ — ابو جاوید استاذ جامعہ — ۵۰

وقت کی آہٹیں
جرمنی میں ایک انوکھا روحانی تجربہ — امجد علی — ۵۶

شعر و نغمہ
حیاتِ نو — ابو البیان حماد
عمر فاروقؓ — ابو المجاہد زاہد

جامعہ کے لیل و نہار — ۶۳
ششماہی امتحانات — ادارہ

اداریہ

بھارت کے مسلم طلبہ اور نوجوان دوراہے پر

آج بھارت کا ہر مسلم نوجوان اور ہر طالب علم دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف دستورِ ہند کے رہنما اصول میں دفعہ ۴۴ کے تحت تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کا مطالبہ اور اس کی حمایت کا سامنا ہے تو دوسری طرف مرادآباد، علیگڑھ، دربھنگہ اور پٹنہ میں پی۔ اے۔ سی اور پولیس کی ننگی جارحیت اور ظلم و بربریت، اس پر مستزاد وزیر اعلیٰ، وزیر داخلہ و وزیر اعظم کی ظالموں کی کھلم کھلا حمایت اور ان کے ظلم کی پردہ پوشی ہے۔ ایک طرف مذہب غیر محفوظ ہے اور مسلمانوں کے تشخص اور امتیاز کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف ان کی جان و مال، اور عزت و آبرو کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ یہ مسائل ایسی جگہ کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہوتے جہاں عدلیہ آزاد، غیر جانبدار اور مذاہب کا احترام کرنے والی ہو اور انصاف ملنے کی توقع ہو۔ نیز انتظامیہ غیر متعصب، روادار اور مذاہب کا احترام کرنے والی ہو، لیکن جہاں یہ صورت حال نہ ہو وہاں یقیناً یہ مسائل بہت اہم ہو جاتے ہیں اور بھارت میں تو یہ مسائل کچھ زیادہ ہی اہم ہیں کیونکہ یہاں عدلیہ اور انتظامیہ دونوں کو غیر جانبدار اور مذہب کا احترام کرنے والی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی ایک سے زائد مثالیں مل سکتی ہیں جو دونوں کے کردار کو واضح کرتی ہیں اور حقیقتیں خصوصاً مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بھارت ایک ایسا جمہوری ملک ہے جہاں اگرچہ دستور میں اقلیتوں کو بھی حقوق دیئے گئے ہیں لیکن عملاً ایک ہی طبقہ اکثریتی جماعت کی حکمرانی ہے۔ انہی کے کلچر، انہی کی زبان اور انہی کی تہذیب و تمدن کو نہ صرف پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے مواقع مہیا کئے جاتے ہیں بلکہ اس کو دوسروں پر مجبوراً ٹھونسنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ بھارت کی سرزمین پر کتنے ہی مت اور مذاہب نے جنم لیا اور ہندو مذہب کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو ختم کر چکے ہیں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو صدیوں سے نہ صرف باقی ہے بلکہ اس نے ہندو مذہب کے مختلف گوشوں کو متاثر کیا ہے اور لاکھوں ہندو اس سے متاثر ہو کر اسلام کو اختیار کر چکے ہیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر متعصب ہندوؤں کی شعوری طور پر یہ کوشش جاری ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کر کے قومی دھارے میں شامل کیا جائے۔ صورت حال جب اتنی سنگین ہو تو قوم کا سب سے

تیجتی تاثر ہونے کی وجہ سے مسلم طلبہ اور نوجوانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ان حالات کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور پوری ملت کو اس سے نکالنے کی کوشش کریں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا راستہ یا طریقہ ہو سکتا ہے جس کو اختیار کر کے ہم اپنے تشخص کی حفاظت اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کا دفاع کر سکتے ہیں اور کیا ان راستوں کا تعین بھی خود کرنا پڑے گا یا کہیں سے ہم کو گائڈ لائن ملے گی؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے جب ہم اپنے بزرگوں اور لیڈرشپ کی طرف دیکھتے ہیں تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ زوال پذیر قوم کی زوال پذیر لیڈرشپ معمولی معمولی باتوں پر بھی متفق نہیں ہو پاتی۔ اس کا ایک بڑا مظاہرہ اس وقت ہوا جب دلی میں بوٹ کلب پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے قوم کے نوجوانوں نے ایک عظیم الشان مظاہرہ کیا اور ۳۰ مارچ کو عظیم الشان مظاہرہ کے باوجود امن عامہ کو برقرار رکھ کر تاریخ کا ایک شاندار باب بنا دیا لیکن جب لیڈروں کی باری آئی تو سر پر کفن باندھے ہوئے عوام کے سامنے جوتیوں میں دال بانٹنے لگے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے۔ جس لیڈر کو قوم کے جس نفسیات کا تجربہ تھا اسی کے مطابق اس نے اپنی تقریر شروع کی اور کام کی باتیں کرنے کے بجائے پوری نوجوان ملت کو تقریروں کی نذر کر دیا۔ لہٰذا ان سے کسی طرح کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اب سوال کا دوسرا جزو رہ جاتا ہے کہ ہم راستے کا تعین خود کریں۔ تو آخر وہ کون سا راستہ ہو۔ اس سلسلے میں ہمارے اکثر نوجوانوں کا خیال ہے کہ اس کے لئے ہمیں پنجابیوں اور گورکھا لینڈ تحریک کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ انھوں نے اپنی بے پناہ جارحانہ کارروائیوں سے حکومت اور اکثریت کا ناطقہ بند کر دیا ہے اور اب حکومت اور اکثریت ان کے مطالبات کے سامنے جھکتی نظر آتی ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ہمارے ۳۰۰ ہزار نوجوان مارے جائیں گے لیکن حکومت کو ہماری قوت طاقت کا اندازہ تو ہو جائے گا۔ میرے خیال میں نوجوانوں کو یہاں تک سوچنے کے لئے حکومت ہی نے مجبور کیا ہے وہ ایسی تمام باتوں پر کان نہیں دھرتی جو پُر امن طریقے سے کہی جاتی ہیں۔ وہ صرف طاقت اور توڑ پھوڑ کی زبان سمجھتی ہے۔ پنجاب، آسام، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ہم مسلم نوجوانوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ کیا جد و جہد کا یہی ایک راستہ ہے؟ اور کیا واقعی یہ راستہ ہمارے لئے مفید ہے؟ اور اس کے دور رس اثرات ہماری ملی زندگی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں؟ جذباتیت سے الگ ہٹ کر اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ یہ راستہ ہمارے لئے بالکل ہی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اپنے دامن میں جو مضر اثرات مرتب کرے گا صدیوں تک ہم اس سے نجات نہیں پا سکتے۔ ممکن ہے ایسا کر کے ہم اپنی طاقت کا لوہا

منوائیں، حکومت اور اکثریت کو پریشان کریں اور ہو سکتا ہے چند بعض مطالبات بھی منوا لیں لیکن اس راستہ کو اختیار کر کے ہم ہندو قومیت کے مقابلے میں ایک مسلم قومیت کو کھڑا کریں گے اور جب دو قوموں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو ہمیشہ مضبوط، عددی اعتبار سے طاقتور اور عصری علوم سے لیس قوم ہی غالب آتی ہے اس کے برخلاف اگر کسی نئی قوم کا بااصول ملت سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو ہمیشہ بااصول اور باکردار ملت ہی غالب آتی ہے چاہے نئی قوم کو کتنی ہی عددی برتری اور اسلحوں پر فوقیت حاصل ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا کریں؟ اس کا جواب کچھ زیادہ وقت طلب اور دشوار نہیں ہے۔ ہم اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے راستے کا انتخاب کریں جو پُر امن ہو۔ تاریخ کے اعتبار سے درست ہو اور ہماری ملی شان کے مطابق ہو ___ یہ بات ذہن میں تازہ رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے کروڑوں انسانوں میں سے ہمارا انتخاب کیا ہے اور ہم کو امت وسط اور امت عدل بنایا ہے۔ ہم عام انسانوں کی طرح نہیں ہیں اور دوسری اقوام کی طرح ہم کوئی قوم بھی نہیں ہیں بلکہ ہم ایک اصولی ملت اور داعی گروہ ہیں؛ ہمارے ذمے خود اللہ تعالیٰ نے کچھ کام سونپا ہے اور وہ کام ہے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اسلام کے سیدھے، سچے اور پاکیزہ راستہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی ___ جہنم کے شعلوں کی طرف بڑھتے ہوئے انسانوں کے رخ کو جنت کی طرف موڑنا ___ بھلائیوں کی دعوت دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ یہ کام چونکہ دشوار ہے اور طویل جد و جہد کا طالب ہے اس لئے ہمارے دماغ میں نہیں آتا لیکن کرنے کا حقیقی کام یہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی میں ہر ہر قدم پر ہم کو اس کے نمونے ملیں گے۔ ہمیں اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اسے اپنے عمل میں مشعل راہ بنانا چاہئے۔

ہمیں اپنے اخلاق و کردار پر بھی گہری نظر ڈالنی چاہئے اور اسے دعوت سے ہم آہنگ کرنا چاہئے۔ جب سے ہم نے اپنے آپ کو داعی کے منصب سے ہٹا لیا اور ایک مسلم قوم کی جگہ کھڑا کر لیا ہے ہمارے اندر تعصب، تنگ نظری اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمیں اس کو ختم کرنا چاہئے ___ ہم اب زیادہ دیر تک دوراہے پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ان دونوں راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے اور دوسرا پہلے سے یقیناً بہتر اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔

[illegible]

۱۲-۹-۱۹۸۷

مولانا جلیل احسن ندوی

مطالعۂ قرآن

تطہیر اور ارسال کا مفہوم

اعراف، آیت ۸۲ (وما کان ...... یتطہرون) کا ترجمہ مولانا اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے:

”اس پر اس کی قوم نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔“

(تدبر دوم صفحہ ۶۶۸)

یہ آیت حضرت لوط علیہ السلام کی تاریخ دعوت سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو ہم جنسی معاشرت سے روکا تو اس روکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنے علاقے سے نکالنے کا فیصلہ کیا کہ ہم لوگ تو سراپا گندگی میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بڑے پاکیزہ لوگ ہیں۔ ہم گندوں میں ان پاکیزہ اور طہارت پسند لوگوں کا کیا کام۔ مولانا نے ”پارسا بنتے ہیں“ کا ترجمہ کیا ہے جو غلط ہے۔ ان کو غلط فہمی اس سے ہوئی ہوگی کہ یتطہرون کا فعل باب تفعل سے آیا ہے اور اس باب کا ایک خاصہ تکلف ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس باب کے خصوصیات میں ایک خاصہ تکلف ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر لفظ جو اس باب سے آئے وہ تکلف کا معنی دے۔ تطہّر کے معنی پارسا بننے کے نہیں آتے بلکہ بہت زیادہ پارسا اور پاکیزہ ہونے کے آتے ہیں۔ قرآن مجید سورہ توبہ آیت ۱۰۸ میں ارشاد ہوا ہے فیہ رجال یحبون ان یتطہروا (اس مسجد میں ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جو محبوب رکھتے ہیں بہت زیادہ پاکیزگی کو) یہاں وہ اصلاحی ترجمہ کرنا بالکل غلط ہوگا۔ اس کے آگے کا جملہ تکلف والے ترجمہ کی گنجائش بالکل ختم کر دیتا ہے وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ (اللہ محبوب رکھتا ہے ان لوگوں کو جو بہت زیادہ پاکیزگی پسند کرنے والے ہیں)۔ اسی طرح سورہ بقرہ آیت ۲۲۲ بھی دیکھ لیجیے۔ غرض ۵، ۱۰ مقامات پر یہ لفظ باب تفعل سے آتا ہے تو اس کا ترجمہ پارسا بننے سے جو لوگ کرتے ہیں غلط کرتے ہیں۔ صحیح ترجمہ وہ ہے جو ہم اوپر کر چکے ہیں۔

سورہ اعراف آیت ۱۰۵، فارسل معی بنی اسرائیل کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے ”تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو“ (تدبر قرآن دوم ص[illegible]) اور اس کی تفسیر کے حصہ میں فرماتے ہیں:

”قرآن میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ تورات کی کتاب خروج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ابتداءً یہ مطالبہ فرعون کے سامنے اس شکل میں رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ عبادت کے لیے جانے دو۔ فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ غصہ میں آکر بنی اسرائیل کی بیگار اور مشقت میں مزید اضافہ کرنے کے احکام جاری کر دیے کہ یہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں، اسی وجہ سے عبادت وغیرہ کے بہانے تراش کر رہے ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ کے معجزہ سے تنگ ہو کر جب وہ ذرا نرم پڑا تو اس نے دریافت کیا کہ تم کہاں عبادت کیلئے جانا چاہتے ہو؟ یہ عبادت اسی شہر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ ہم اس عبادت کے لئے تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے۔ یہاں ہم یہ عبادت اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہم جس چیز کی قربانی کرنا چاہتے ہیں اس کی قربانی اگر ہم نے یہاں کی تو یہ مصری ہمیں سنگسار کر دیں گے۔“ (تدبر قرآن دوم ص[illegible])

مولانا کی یہ تفسیر تورات کی کتاب خروج پر مبنی ہے اور ہمارے خیال میں انھوں نے تفسیرات یہ تفصیل پیش کی ہے۔ اس پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں، پہلا یہ کہ قرآن کی جن سورتوں میں فرعون سے اس موسوی مطالبہ کا ذکر نہیں ملتا، دوسرے دور کی سورتوں میں بھی نہیں ملتا، ملتا ہے تو دور سوم کی سورتوں میں۔ اس دور کی سورتوں میں جبکہ یہ پندو مظالم اہل ایمان پر توڑے جا رہے تھے، بیشتر لوگوں کو پا بزنجیر کیا جا رہا تھا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوڑ کر نہ پہنچ سکیں اور تربیت سے محروم رہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطالبہ دور آخر کا مطالبہ ہے جب اسرائیلی مومنین کو موسیٰ کے پاس جانے سے بجبر روکا جا رہا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ارسال کے معنی بھیجنے یا جانے دینے کے نہیں آتے بلکہ ”چھوڑنے“ کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے۔ یہ ”امساک“ کا ضد ہے جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ سورہ فاطر آیت ۲ کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ اپنی جو رحمت بھی لوگوں کو دینا چاہے اسے روکنے والی کوئی طاقت نہیں اور جس رحمت کو وہ روکنا چاہے تو خدا کے روکنے کے بعد اسے کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ بھیجنے کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے جب کہ اس کے بعد ”الیٰ“ ہو یا پھر کوئی قرینہ ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ صورت ہو کہ تین دن کی مسافت دور جانا چاہتے ہیں کہ مومنین کو لے جانا چاہتے ہیں اور
یہ مطالبہ انھوں نے فرعون سے کیا ہے کہ وہ یہ مطالبہ پیش کر رہے ہیں کہ اسرائیلی مومنین کو تم نے یہ صبر
روک رکھا ہے ان کو میرے پاس آنے نہیں دیتے، اسے ختم کرو، انھیں میرے پاس آنے دو تاکہ میں
ان کی دینی تربیت کروں۔ یہ اپنے مضاف الیہ کے ساتھ ہمیشہ حال واقع ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے
آیت کے اس جملے کا ترجمہ یہ ہوگا۔ "تو تو بنی اسرائیل کو چھوڑ دو میرے ساتھ رہیں گے"۔

دوسرے دو ایک مترجمین نے بھی چھوڑنے کا ہی ترجمہ کیا ہے۔ یہ دونوں سوال جو اوپر پیش کیے
گئے بہت اہم ہیں۔ قرآن کے طلب کی سمت پر غور کرنا چاہیے اور سورہ دخان آیت ۱۸ میں "اَدُّوا اِلَیَّ
عِبَادَ اللّٰہِ" کے الفاظ آئے ہیں، کیا وہ میری رب کی تائید نہیں کرتے؟ اَدّٰی یُؤَدِّی کے بعد جب الی آئے
تو پہنچانے اور واپس دینے کے معنی آتے ہیں۔ دخان والے جملہ کا ترجمہ یہ ہوا: اے فرعونیو! اللہ کے بندوں
بنی اسرائیل کو مجھ تک پہنچنے دو، انھیں میرے پاس آنے دو۔" سورہ آل عمران آیت ۷۵ میں خیانت کار
یہودیوں کے بارے میں لَا یُؤَدِّہٖٓ اِلَیْکَ کے الفاظ آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "یہ لوگ اتنے بے ایمان ہیں
کہ تمہارا ایک دینار بھی تم تک نہ پہنچنے دیں گے، مار کھائیں گے۔" اور سورہ نساء آیت ۵۸ میں ارشاد ہوا
کہ "اے اہل ایمان! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانات وحقوق کو ان کے اہل تک یعنی اہل حقوق تک
پہنچاؤ۔" غرض موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ بنی اسرائیل کو بیابان میں تین دن کی مسافت پر
لے جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں گئے کی قربانی کروں اور وہیں اہل ایمان کی تربیت کروں، ان کی دعوت گاہ
اور اہل ایمان کی تربیت گاہ تو مصر تھی، اسے وقت سے پہلے چھوڑ کر کیسے جاسکتے تھے۔ انبیاء اپنے
دعوتی علاقے کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک قوم ان کی ہلاکت کا فیصلہ نہیں کرتی۔ گزرانے
میں کسی نے غیرت حق کے جوش میں ہلاکت کے فیصلے سے پہلے علاقہ چھوڑا ہے تو اسے خدا کے عتاب
کا نشانہ بننا پڑا ہے اور جب فرعون اور اس کے حکام نے موسیٰ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا ہے تب خدا کے حکم
سے، خدا کی نگرانی اور حفاظت میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کی ہے اور سینا کے صحرا کو پناہ اور ہجرت
بنایا ہے۔

مولانا سید احمد عروج قادری

صبر

صبر کو ترقی دینے کی تدابیر

"صبر" کی ان تفصیلات کو سامنے رکھنے کے بعد اس میں تو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس کے بغیر دوزخ سے نجات مل سکتی ہے نہ جنت
ہی میں جو ملتی ہے اور نہ دین میں کوئی مقام حاصل ہوسکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قوت کو کیسے
بڑھایا جائے اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ اگر یہ سوال مخلص بندے کا سوال ہو تو اس کا جواب یہ ہے
کہ سب سے پہلی چیز طلب صادق اور اپنا عزم وارادہ ہے۔ طلب صادق اور تمنا کے نام میں فرق یہ ہے کہ
پہلی چیز انسان کو عمل پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری چیز اسے صرف خیالات میں الجھائے رکھتی ہے۔ اس طلب صادق
کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "جو شخص عفت چاہے گا اللہ اسے عفیف بنا
دے گا اور جو قلب کا غنا طلب کرے گا اسے اللہ غنائے قلب عطا فرمائے گا اور جو بہ تکلف صبر اختیار کرے گا
اللہ اس کو صبر اختیار کرے گا۔" ہم یہاں صبر کو ترقی دینے کی چند تدابیر کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اضافۂ علم ویقین کی سعی: جیسا کہ اوپر امام غزالی کے حوالے سے گزرا، صبر جس حالت کا نام ہے
وہ علم ویقین سے پیدا ہوتی ہے اس لیے جب تک اس میں اضافہ نہ ہو صبر کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ یہاں
علم ویقین میں اضافے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی بے نیازی کے تصور کو تازہ اور زندہ
کیا جائے، گناہوں اور اللہ کی نافرمانیوں کے عظیم نقصانات اور ان کے ہولناک نتائج کو ذہن میں حاضر کیا
جائے۔ اسی طرح نیکیوں اور اللہ کی فرمانبرداری کے عظیم و بے پایاں اجر کو سامنے رکھا جائے۔ قیامت کی
ہولناکیوں اور دل دہلا دینے والی منزلوں پر یقین کو تازہ کیا جائے اور اس کے علاوہ اللہ کے حسنات
اپنی بندگی وغلامی کا شعور پیدا کیا جائے۔ دنیا اور دنیا کی حقارت، اس کی فنا پذیری اور خود اپنی زندگی
کی بے ثباتی پر غور کیا جائے۔ یہ تمام آیات ہیں، شعور مومن کے دل ودماغ میں موجود ہوتی ہیں، ضرورت اس

۱۔ احیاء العلوم ج ۳

بات کی ہے۔ تنہائیوں میں ان پر غور و فکر کرکے انھیں دہرایا جائے اور مستحضر کیا جائے۔ اسی علم و یقین نے انبیاء علیہم السلام کو صبر کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا تھا اور یہی انہیں کے ماننے والوں کو صابرین کے گروہ میں داخل کیا اور قیامت تک داخل کرتا رہے گا۔

(۲) قرآن اور احادیث کا مطالعہ، یہ مقالہ سمجھ کر ہونا چاہئے، بالخصوص ان حصوں اور مقامات کا مطالعہ جن میں انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے دوسرے نیک بندوں کے حالات و واقعات اور ان کی صفات مذکور ہیں۔ اس کے علاوہ ان مقامات کا مطالعہ جن میں قیامت اور آخرت کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں کس چیز نے انھیں بے صبری سے بچایا اور حق و صداقت اور اطاعت پر قائم رکھا۔ میں یہاں چند واقعات کی طرف بطور مثال صرف اشارہ کرتا ہوں، ان مقامات کو تفصیل کے ساتھ قرآن میں پڑھ لیا جائے۔

(الف) حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے درمیان جو واقعہ ہوا تھا اس کی تفصیل سورۂ یوسف میں پڑھ کر دیکھئے کہ کس چیز نے انتہائی نازک حالت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دامنِ عفت کو آلودگی سے بچایا اور صبر کا وہ کتنا اعلیٰ مقام تھا جو انھیں حاصل ہوا۔ جس چیز نے انھیں محفوظ رکھا وہ صراحۃً اس جملے میں موجود ہے جو عین موقع پر انھوں نے کہا تھا:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّيْ أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (یوسف ع ۳)

یوسفؑ نے کہا خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے بھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ پر جو احسان کیا تھا اس کے بے پناہ جذبۂ شکر نے ان کو معصیت کے ارتکاب سے بچا لیا۔

(ب) فرعون کے ساحر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور فرعون نے انھیں سخت ترین سزا کی دھمکی دی تو اس سخت حالت میں کس چیز نے انھیں حق پر قائم رکھا اور بتایا کہ وہ صبر کے اس اونچے مقام پر کس طرح پہنچ گئے؟ وہ چیز بھی ساحروں کے جواب میں صراحۃً موجود ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ أَنْتَ قَاضٍ

جادوگروں نے جواب دیا قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن

إِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ (طٰہٰ ع ۳)

نشانیاں آجانے کے بعد بھی صداقت پر تجھے ترجیح دیں، تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

آخرت کی زندگی کے دوام اور دنیوی زندگی کی بے ثباتی کا زندہ شعور تھا جس نے نو مسلم ساحروں کو مرکزِ ثبات بنا دیا اور وہ صبر کے اونچے مقام تک پہنچ گئے۔

(ج) فرعون کے دربار میں ایک مردِ مومن کی تقریر اور سوال و جواب کی تفصیل سورۃ المومن رکوع ۴-۵ میں پڑھئے۔ اس بصیرت افروز واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فرعون جیسے جبار اور اس کی قوت کے سامنے کس چیز نے مردِ مومن کو ثابت قدم رکھا؟ یہ چیز بھی ان کی تقریر کے آخری ٹکڑے میں صراحۃً آئی ہے:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ أَقُوْلُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْٓ إِلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (المومن ع ۵)

آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے اور اپنا معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔

"تفویض" مقاماتِ تصوف کا ایک بلند مقام ہے۔ یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مردِ مومن کو اس یقین نے صبر کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے وفادار بندوں کے تمام معاملات کا کفیل و وکیل ہے۔ انھوں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور مطمئن ہو گئے۔ آگے کی آیت بتاتی ہے کہ اللہ نے انہیں فرعونیوں کے مکر و شر سے بچا لیا۔

(د) سورۂ یٰس رکوع ۲ میں "اصحاب القریہ" کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ داعیانِ حق کو اس قوم نے سنگسار کر دینے کی دھمکی دی تو اس قوم کے ایک مردِ مسلمان دوڑتے ہوئے آئے، اور داعیانِ حق کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ انھوں نے اپنی قوم کو اس بڑے جرم سے روکنے کے لئے تقریر کی لیکن قوم ماننے کے بجائے ان کی دشمن ہو گئی اور آخر کار انھیں شہید کر ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں اتنا صبر کہاں سے آیا کہ جان دے دی لیکن ذرہ برابر مداہنت گوارا نہ کی۔ اس کا جواب ان کی تقریر میں موجود ہے۔ ان کو آخرت کے یقین اور اس یقین نے ثابت قدم رکھا کہ نفع و ضرر صرف اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ قرآن اور احادیث میں اس طرح کے بہت واقعات ملیں گے۔

(۲) صبر کو ترقی دینے کی تیسری تدبیر عمل ہے۔ امراض روحانی جتنے بھی ہیں ان کی دوا علم و عمل سے مرکب ہوتی ہے۔ ہر مرض اور ہر غفلت کے لئے ایک الگ علم اور الگ عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں ان سب کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ دوسرے امراض اور غفلتوں کے علاج کے لئے بھی نمونہ بن سکتی ہیں۔

(الف) فرض کیجئے کوئی مسلمان ایسا ہے جس کی نماز فجر غائب ہو جاتی ہے یا اکثر جماعت چھوٹ جاتی ہے۔ یہ ایک غفلت ہے جس کا علاج مطلوب ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ اس غفلت کا سبب کیا ہے؟ کیونکہ جب تک وہ سبب دور نہ ہو یہ غفلت دور نہ ہوگی۔ اگر اس کا سبب بے پروائی ہو تو اسے یہ علم حاصل کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس کے لئے وہ نماز پڑھتا ہے، وقت پر اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی اہمیت کیا ہے نیز اسے یہ بھی جاننا اور سوچنا چاہئے کہ وہ اس غفلت کی وجہ سے روزانہ یا اکثر اپنے آپ کو کتنے بڑے اجر سے محروم کر رہا ہے۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ نماز باجماعت، منفرد نماز سے ۲۵ یا ۲۷ درجہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسے سوچنا چاہئے کہ دنیا میں مثال کے طور پر روزانہ یا اکثر پچیس یا ستائیس روپیوں کا نقصان گوارا کرنے کے لئے تیار ہے؟ حالانکہ ۲۷ درجوں کا جو اجر ہوگا وہ دنیا کی کسی قیمت سے ناپا نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ اس کی یہ بے پروائی اللہ کے نزدیک کتنی ناپسندیدہ ہوگی اور اس بات کا کتنا اندیشہ ہے کہ اس بے پروائی کے ساتھ جو نماز فجر وہ پڑھ رہا ہے خواہ قضا پڑھ رہا ہو یا وقت کے اندر تنہا ادا کر رہا ہو اللہ کی بارگاہ میں ناقابل قبول قرار پائے۔ اگر نماز پڑھنے والا مومن مخلص ہے تو انشاء اللہ اس تفکر اور غور و فکر سے غفلت میں کمی واقع ہوگی اور وہ مسلسل فکر کرتا رہا تو بتدریج غفلت دور ہو جائے گی۔ اس عمل تفکر کے علاوہ اسے یہ بھی کرنا چاہئے کہ اپنے اوپر ایک ایسا عمل لازم کرے جو اس کے نفس پر شاق ہو مثلاً اپنے اوپر کچھ صدقہ کرنا لازم کرنے یا ایک دن کا روزہ یا کچھ نوافل لازم کرے۔ غرض جو چیز اس کے نفس پر زیادہ شاق ہوتی ہو، ہر قضا یا ترک جماعت کے عوض وہی اپنے اوپر لازم کرے اور اگر نماز فجر قضا ہونے یا جماعت چھوٹ جانے کا سبب رات کو دیر تک جاگنا ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ اس عادت کو ترک کر دے۔ نماز عشاء کے بعد دیر تک جاگنے اور غیر ضروری کاموں میں مشغول رہنے کی ممانعت احادیث میں اسی لئے آئی ہے ضرورت سے جاگنا الگ چیز ہے لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ البتہ دیر تک جاگنے کی عادت بنا لینا جبکہ اس کی وجہ سے نماز فجر میں

خلل واقع ہوتا ہو ایک جرم ہے جسے ترک کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عمل اس کو کرنا چاہئے وہ یہ کہ یا تو وہ اپنے اوپر تہجد کی نماز لازم کرلے یا کم سے کم وقت جماعت سے اتنا پہلے جاگنا لازم کرے کہ ضروریات سے فراغت، وضو اور سنتوں کے بعد جماعت کی تکبیر اولیٰ پالے۔ نیند نہ ٹوٹنے کا بہانہ ایک نفسانی بہانہ ہے اسے رد کر دینا چاہئے۔ جب اسے نماز فجر کے وقت یا اس سے پہلے کہیں سفر کرنا ہوتا ہے تو کس طرح نیند ٹوٹ جاتی ہے؟ یا تو وہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ وقت پر اس کو جگا دیا جائے یا جو فکر اسے لاحق ہوتی ہے وہ خود اسے وقت پر جگا دیتی ہے۔ ایک بات اور ہے اگر غفلت کی وجہ سے کسی نماز کے قضا ہو جانے یا جماعت چھوٹ جانے کا اسے صدمہ پہنچے، دل میں حسرت اور تاسف کی کیفیت پیدا ہو اور اللہ سے اس کی معافی مانگے تو یہ عمل آئندہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۳) اگر کوئی مسلمان گھمنڈ میں مبتلا ہے جو ایک سخت روحانی اور قلبی مرض ہے تو اس مرض کی دوا بھی علم و عمل دونوں سے مل کر تیار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، اور چونکہ یہ نعمتیں اور صلاحیتیں آزمائش کے طور پر دی گئی ہیں اس لئے ان میں یکسانی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی نعمت زیادہ دی جاتی ہے کسی کو کم، کسی کو کوئی صلاحیت زیادہ عطا کی جاتی ہے اور کسی کو کم۔ انسان کے اندر گھمنڈ اور تکبر انہی نعمتوں اور صلاحیتوں میں کسی ایک یا چند پر پیدا ہوتا ہے کسی کو مال پر، کسی کو جمال پر، کسی کو جاہ و مرتبہ پر، کسی کو علم و فضل پر، کسی کو ذہانت پر، کسی کو بدن کی قوت پر اور کسی کو عبادت پر۔ علم اور عبادت پر گھمنڈ تو درحقیقت ان دونوں کی نفی کے برابر ہے۔ تکبر کی حقیقت تین اجزاء سے مل کر تیار ہوتی ہے۔ اس کا ایک جز تو خود تکبر کرنے والا ہے دوسرا وہ شخص یا اشخاص ہیں جن پر تکبر کر رہا ہے اور تیسرا جز وہ چیز ہے جس کی بنا پر تکبر کر رہا ہے۔ تکبر کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نعمت یا صلاحیت کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے بلند درجہ اور ان کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھے۔ یہ ایک قلبی و نفسی مرض ہے جس کا اظہار متکبر کے افعال اور اس کے حرکات و سکنات سے ہوتا ہے مثلاً کسی مجلس و محفل میں جائے تو ان لوگوں کے درمیان بیٹھنا گوارا نہ کرے جنہیں وہ اپنے سے کم مرتبہ اور حقیر سمجھتا ہے یا ان لوگوں کو جنہیں وہ اپنے سے پست سمجھتا ہے، ابتداءً سلام کرنا کسر شان تصور کرے اور جواب بھی اس انداز میں دے جیسے وہ ان پر کوئی احسان کر رہا ہے یا جیسے وہ حقیر سمجھتا ہے۔ اگر وہ اس کو نصیحت کرے تو اسے قبول نہ کرے بلکہ اسے اپنی توہین قرار دے مثلاً یہ کہ ایک تھرڈ کلاس آدمی، فرسٹ کلاس آدمی کو نصیحت کرنے کا کیا

حق رکھتا ہے یا ایسا کوئی شخص اس کی کسی بات کو رد کر دے تو وہ غضب ناک ہو جائے۔ غرض اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو تکبر کی علامت قرار پاتی ہیں۔

اس خطرناک نفسانی بیماری کے لئے سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اس کا تکبر حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کم سے کم کوئی مومن و مسلم یہ نہیں سمجھتا کہ جو نعمت و صلاحیت اس کے پاس ہے وہ کسی کا عطیہ نہیں بلکہ اس کا اپنا ذاتی ہے۔ وہ عقیدۃً یہی سمجھتا ہے کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے پھر جو چیز اس کی ذاتی نہیں بلکہ خیرات کے طور پر اس کو ملی ہے اس پر گھمنڈ اور تکبر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس خیرات کا شکر یہ نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جنھیں یہ خیرات کم ملی ہو گھمنڈ کرے بلکہ یہ ہے کہ ان کے سامنے تواضع اختیار کرے، ورنہ یہ سمجھے کہ شاید اللہ نے یہ نعمت مجھے زیادہ دے کر آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ تکبر کے علاج کا دوسرا علمی حصہ یہ ہے کہ اس کی برائی اور مذمت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطالعہ کرے اور اس کے ساتھ وہ ان آیات و احادیث کو بھی پڑھے جن میں تواضع کی فضیلت اور اس کا اجر بیان کیا گیا ہے۔ یہ علمی حصہ غور و فکر اور تامل و تفکر کے پیچھے چلنے کو تقویت پہنچائے گا۔

اس علاج کا عملی جز یہ ہے کہ جو اعمال تکبر کی علامت ہیں ان کے خلاف اعمال و افعال کو بتدریج اپنی عادت بنائے۔ اس سلسلے میں بطور اسوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، و تابعین کے واقعات و حکایات کا پر خلوص مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

(۱) ایک بار ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو اس پر آپؐ کی ہیبت سے لرزہ طاری ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا گھبراؤ، سکون سے بیٹھو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں قبیلہ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو دھوپ میں سوکھا ہوا نمکین گوشت کھاتی تھی۔ [۱]

(۲) ایک بار حضرت عمرؓ نے مشک اپنی گردن پر اٹھائی اور باہر نکلے۔ لوگوں نے پوچھا اے امیر المومنین، یہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا۔ میرے نفس میں خود پسندی کا خیال پیدا ہوا تو میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں۔ [۲]

(۳) ایک رات حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کچھ لکھ رہے تھے اور ان کے پاس ایک مہمان بھی ٹھہرے ہوئے

[۱] احیاء العلوم ج ۲، بیان تواضع صلی اللہ علیہ وسلم۔ [۲] ازالۃ الخفا مقصد دوم

تھے، چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور وہ بجھنے لگا۔ مہمان نے اجازت طلب کی کہ میں اٹھ کر چراغ میں تیل ڈال دیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ اخلاق سے بعید ہے کہ مہمان کو زحمت دی جائے۔ تب مہمان نے کہا میں خادم کو جگا دیتا ہوں وہ اسے درست کر دے گا۔ جواب ملا نہیں، یہ ابھی سویا ہے۔ پھر وہ خود اٹھے اور تیل کی کپی سے چراغ میں تیل ڈال کر اسے ٹھیک کیا اور جب اپنی جگہ واپس آئے تو مہمان نے تعجب سے کہا۔ اے امیر المومنین، آپ نے خود زحمت کی؟ جواب میں انھوں نے فرمایا جب میں اٹھ کر گیا تو عمر تھا اور جب واپس آیا تو عمر ہوں۔ [۱]

یہ تین واقعات محض نمونے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اس طرح کے واقعات پڑھ کر مومن کا قلب متاثر ہوتا ہے اور مرض کبر سے نجات پانے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔

(ج) کوئی مسلمان بخل کی بیماری میں مبتلا ہے، نہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، نہ رشتہ داروں کے حقوق۔ اس کا علاج کیا ہے؟

بخل، مال کی حد سے متجاوز محبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے حب مال کے اسباب پر غور کرنا ہوگا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مال دار شخص اپنی خواہشات نفس پوری کرنا چاہتا ہے جس کے حصول کا ذریعہ اکثر و بیشتر مال ہی ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنی عمر بھی طویل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص کو قطعی علم حاصل ہو جائے کہ کل اسے مر جانا ہے، تو وہ محض ایک دن کی زندگی کے لئے بخل اختیار نہیں کرے گا۔ یا اس صورت میں ہے کہ وہ صاحب اولاد نہ ہو اور اگر وہ صاحب اولاد ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی زندگی سے طویل معلوم ہوتی ہو بلکہ اب اہل و عیال، محرک بخل کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس کی اپنی ذات کی جگہ لے لیتے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ خود مال ہی اس کا مقصود و مطلوب بن جاتا ہے اور وہ سونا چاندی دیکھ دیکھ کر اور روپے گن گن کر خوش ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے احادیث میں "عبد الدینار والدرہم" (دینار و درہم کے بندے) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایسے اشخاص دیکھے گئے ہیں کہ وہ بوڑھے بھی ہو گئے ہیں صاحب اولاد بھی نہیں ہیں، ان کے پاس مال بھی بہت ہے لیکن وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، بد حدیہ ہے کہ خود

[۱] الرسالۃ القشیریہ، باب الخشوع والتواضع

بیمار پڑیں تو اپنے علاج پر بھی مال صرف نہیں کرتے۔ نہ خدا کا حق ادا کرتے ہیں نہ اپنی ذات کا اور نہ دوسرے بندگانِ خدا کا۔ یہ ایک ایسا شدید قلبی مرض ہے، اس کا علاج بہت مشکل ہے بالخصوص جبکہ ایسا شخص بڑھاپا بھی ہوگیا ہو۔ عام طور سے مال کی محبت اور بخل کے اسباب بھی ہوتے ہیں۔ اس کا علاج بھی علم اور عمل سے مرتب ہے۔ علمی جز یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد و خیالات اور ایمان و یقین کا از سرِ نو جائزہ لے اور ان پر غور و فکر کرے۔ جیسا کہ اوپر تدابیر بیان کرنے سے پہلے لکھا گیا ہے کسی بھی مرض کو دور کرنے کے لئے اوّل قدم یہ ہے کہ مریض کو اپنے مرض کا احساس ہو اور اس کے علاج کے لئے طلبِ صادق پیدا ہو جائے۔ بخیل کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ مال کو اللہ کا عطیہ اور اپنے پاس امانت سمجھتا ہے کہ نہیں؟ اگر خدانخواستہ اس کے اس عقیدے میں ہی خلل آگیا ہو تو سب سے پہلے اپنے اس عقیدے کو تازہ کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر مال میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا کرنا سخت مشکل ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی ذات اور اہل و عیال پر اسراف کی حد تک مال خرچ کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اس لئے اللہ و رسولؐ کی نظر میں وہ بخیل ہی ہوتے ہیں۔

بخل کی شرعی تعریف بھی یہ ہے کہ انسان مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے اور اللہ کے واجب کردہ حقوق میں اسے خرچ نہ کرے۔ بخیل مسلمان کو وہ لرزہ خیز سزائیں بھی یاد کرنی چاہئیں جو قرآن و احادیث میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان دُنیوی و اُخروی فوائد کو بھی سامنے رکھنا چاہئے جو زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو حاصل ہوں گے۔ یہ ایک اجمالی نظریہ ہے۔ اس کے بعد ہر بخیل شخص کو اپنے اپنے خاص اسبابِ بخل پر تفصیل کے ساتھ غور کرنا چاہئے مثلاً جیسا کہ اوپر کہا گیا اگر کسی کو اپنی زندگی بہت طویل معلوم ہوتی ہو تو اسے سوچنا چاہئے کہ آخر اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ جب وہ سوچے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ ایک شیطانی و نفسانی وسوسہ ہے کسی کو علم نہیں کہ کب موت کا فرشتہ اس کی گردن پکڑ لے گا۔ اگر اولاد، محبتِ مال اور بخل کا سبب بنی ہوئی ہے تو اسے سوچنا چاہئے کہ اللہ نے کسی وجہ سے اولاد کو فتنہ کہا ہے پھر اسے یہ عقیدہ تازہ کرنا چاہئے کہ ہر بچہ اپنے ساتھ اپنی روزی لاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کتنے ایسے بچے جن کے والدین ان کے لئے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے ان کی مالی حالت ان بچوں سے بہتر ہوگئی جن کے والدین ان کے لئے بہت کچھ چھوڑ کر مرے تھے۔

بخل کے علاج کا عملی جز یہ ہے کہ جیسے ہی اللہ کی توفیق اور علم و معرفت کے نتیجے میں احساس اور طلب تازہ ہو فوراً بلا تاخیر زکوٰۃ ادا کرنے اور حقوقِ واجبہ ادا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھائے، یہ انتہائی ضروری بات ہے اس کے بغیر اس کا مرض دور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے ساتھ شیطان اور اس کا اپنا نفس ہر وقت

لگا ہوا ہے۔ تاخیر کرنے لگے ہوتا یہ ہے کہ دونوں اس کے جذبۂ خیر کو سرد کرنے میں لگ جاتے ہیں اور عموماً اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے ایک بزرگ ابو الحسن بوشنجیؒ کی یہ حکایت نقل کی ہے کہ ایک دن وہ کسی ضروری کام میں مشغول تھے کہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا اور کہا کہ میرے جسم سے قمیص اتار کر فلاں شخص کو دے آؤ۔ شاگرد نے عرض کی کہ آپ اپنے اس کام سے فارغ ہو کر قمیص بھجوا سکتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ تاخیر کرنے سے کہیں میرا ارادہ بدل نہ جائے۔

مرضِ بخل کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان بہ تکلف دل پر جبر کر کے مال خرچ کرے۔ دو چار دس بار کے بعد تکلف اور جبر کی کیفیت کم ہوتی جائے گی اور پھر وہ بلا تکلف حقوقِ واجبہ ادا کرنے لگے گا۔

صبر کو ترقی دینے کی ان شکلوں کا حاصل یہ ہے کہ صبر کی دلی حالت کو استعمال کئے بغیر عملی حالت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح تجارت میں جب تک مال صرف نہ کیا جائے نفع کی صورت میں مزید مال کی توقع غلط ہے اسی طرح جب تک فطری طور پر موجود صبر کو استعمال نہ کیا جائے اس میں مزید قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خیالِ خام کے پھندے سے بچائے اور امراضِ قلب کے علاج کے لئے طلبِ صادق عطا فرمائے۔

(۴) صبر کو ترقی دینے کی چوتھی اور سب سے زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کیونکہ اسی کے خزانۂ فیض و کرم سے سب کچھ عطا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ — اے محمدؐ! صبر سے کام لئے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔
(النحل ع ۱۶)

جب صبر اللہ کی توفیق سے ملتا ہے تو اس کے لئے اس سے دعا کرنی ہی چاہئے۔ قرآن میں صبر کے لئے دعا کا نمونہ بھی موجود ہے:

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔ — اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمارے قدم جما دے۔
(البقرہ ع ۳۳)

حقیقت یہی ہے کہ اللہ ہی ہے جو صبر عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو مشکل حالات میں اپنے بندے کو ثابت قدم رکھتا ہے، اس لئے صبر کو ترقی دینے کی ہر صحیح تدبیر اختیار کرتے ہوئے اللہ سے دعا اور اس کے کرم پر اعتماد کرنا چاہئے۔ ● ●

عبید اللہ فہد
شعبہ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

معاشرتی مسائل سے تعرض

دوسری اور آخری قسط

(مضمون کے تمام مندرجات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

اس کا سبب یہ ہوا کہ زبید (یمن کے ایک قبیلے) کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا اور اس سے مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا مگر قیمت نہ دی۔ اس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی مگر سب نے اسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل ہی کے مقابلہ میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابوقبیس پر چڑھ گیا اور اس نے بلند آواز سے آل فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور انہوں نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پھر انہوں نے بنی ہاشم، بنی المطلب، بنی اسد بن عبد العزیٰ، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا (جو حضرت عائشہؓ کا چچازاد بھائی تھا) اور وہاں سب نے عہد کیا کہ مکہ میں شہر کا یا باہر کا جو شخص بھی مظلوم ہوگا اس کی مدد کریں گے اور ظالم سے اس کا حق دلوا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سب مل کر عاص کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان واپس لے کر دیا۔

محمد بن اسحاق نے امام زہری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عبد اللہ بن جدعان کے یہاں ایک ایسے معاہدہ میں

شریک ہوا کہ اگر مجھے سرخ اونٹ بھی اس کے بدلے ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انہیں قبول نہ کرتا اور اگر آج دور اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کے خلاف جدوجہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل بعثت ہی سے شریک تھے اور دور اسلام کا یہ اسوہ دنیا کے تمام مظلومین و مستضعفین کیلئے مژدہ جانفزا ہے۔

ظلم کے خلاف جدوجہد - مکی دور میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو آپ کا مشن ہی یہ قرار پایا کہ ظلم و جاہلیت کا خاتمہ کریں اور خدا کے بندوں کو خدا کی عبادت کرنے کی آزادی دلائیں۔ قرآن نے واضح لفظوں میں انبیاء کی آمد کا مقصد یہ قرار دیا کہ۔

الرسول النبی الامی الذی	وہ پیغمبر امی جس کا ذکر انہیں
یجدونہ مکتوبا عندہم	اپنے ہاں تورات اور انجیل میں
فی التوراۃ والانجیل	لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا
یأمرہم بالمعروف	حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا
وینہاہم عن المنکر	ہے، ان کیلئے پاک چیزیں حلال
ویحل لہم الطیبات	اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور
ویحرم علیہم الخبائث	ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے
ویضع عنہم اصرہم	جو ان پر لدے ہوئے تھے
والاغلال التی کانت علیہم	اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں
(اعراف: ۱۵۷)	وہ جکڑے ہوئے تھے۔

یہاں رسول کا ایک مشن یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقیہوں کی قانونی موشگافیوں راہبوں کے زاہدانہ مبالغوں اور جاہل عوام کے توہمات اور خود ساختہ حدود و ضوابط سے زندگی جن بوجھوں سے دبی ہوئی ہے اور ظلم و انتہا پسندی کی جن جکڑ بندیوں میں

کسی ہوئی ہے رسول ان تمام بندشوں کو توڑ دے اور ان سارے بوجھوں سے اسے آزاد کر دے۔ یہ بات دراصل یہودیوں کے علماء اور رہبان کے پس منظر میں کہی گئی ہے جنہوں نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ نے ان پر عائد کر دی تھیں ان ساری زنجیروں کو رسول امی کی بعثت نے کاٹ دیں۔ یہاں ان مظالم اور ناانصافیوں کا بیان ہے جو خود ساختہ مذہب کی طرف سے انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

اسلام نے بلندیوں تک پہنچنے کیلئے دشوار گذار گھاٹی سے گزرنا ضروری قرار دیا اور اس دشوار گذار گھاٹی کی تعیین اس طرح کی کہ آدمی کسی غلام کو آزاد کر دے یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرے یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑائے۔ بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو قرآن کہتا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: ۱۱ - ۱۶)	اس نے دشوار گذار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گذار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقہ کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں مثلاً فکِّ رقبۃ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد

کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔ مساکین کی مدد کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا بیوہ اور مسکین کی مدد کیلئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص نماز میں کھڑا ہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے (بخاری و مسلم) یتامیٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔ [۱۳]

اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے ہر قسم کے ظلم و استبداد کا استیصال کیا اور جزیرہ نمائے عرب اور باہر کی دنیا میں عدل و قسط کی حکومت قائم کی۔ اسلامی لشکر کی فتوحات کا مقصد ہی یہ تھا کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں اور جور و ستم کے ماحول سے نکال کر عدل و آزادی سے روشناس کرائیں۔[۱۵] لیکن اس وقت جب کہ مکہ میں اسلام مجبور و مظلوم تھا، انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تحریک اسلامی کمزور تھی اور سیاسی و تنظیمی پہلوؤں سے بھی اصحاب رسول بے بس تھے اس وقت بھی تحریک اسلامی کا ہدف ظلم و ستم کے خلاف جہاد تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کار دعوت کی ذمہ داری کی انجام دہی کے عین دوران ظالموں کے خلاف محاذ آرائی جاری رکھی۔ ایک طرف حضورؐ کا اخلاقی رعب تھا جو مخالفین پر چھایا ہوا تھا۔ آپ کا بے داغ کردار تھا جس پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ تھی آپ کا بلند ترین اور پاکیزہ ترین اخلاق، آپ کا حسن سلوک اور آپ کی صداقت دیانت و امانت تھی جس نے دشمنوں اور دوستوں میں یکساں اعتماد اور دبدبہ حاصل

کیا تھا اور دوسری طرف آپؐ کی جرأت و ہمت اور ظلم سے شدید نفرت اور اس کے خلاف ہر دم آمادگی کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے دشمنوں کو بھی آپ کے آگے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔

سیرت نگاروں نے لکھا کہ ایک دفعہ اراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لیکر مکہ آیا ابوجہل نے اس کے اونٹ خرید لئے اور جب قیمت کی ادائیگی کی باری آئی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آکر ایک روز حرم کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمع عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سرداران قریش نے استہزاء کے انداز میں کہا کہ دیکھو ہم کچھ نہیں کر سکتے ہاں وہ صاحب جو اس کونے میں بیٹھے ہیں ان سے جا کر کہو وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے؟ اراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا، "آج لطف آئے گا" اراشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے چنداں اس کی فکر نہ کی کہ ہم تعداد میں تھوڑے ہیں اور ظلم و جبر کی چکی میں ہمارے پیر پس رہے ہیں اور یہاں معاملہ دشمن قد کا ہے جو ذرا بھی قرابت کا پاس یا انسانیت کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ اس فکر نے آپ کو بے چین کیا کہ ظلم ہر حال میں ظلم ہے اور مظلوم کی مدد بہر صورت واجب ہے۔ آپؐ اراشی کو لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے یہ معلوم کرنے کیلئے کہ کیا ماجرا درپیش ہوتا ہے اور محمدؐ کی کیا گت بنتی ہے، پیچھے اپنا ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ بیتے اس کی خبر لا دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا کون؟ آپؐ نے جواب دیا "محمدؐ، باہر نکلو" وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا آپؐ نے اس سے کہا "اس شخص کا حق ادا کرو" اس نے کوئی چوں و چرا نہ کی۔ سیدھا اندر گیا اور اس کے اونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ پر دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا۔ اور سارا ماجرا سرداروں سے کہہ سنایا، واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حکم بن ہشام

جب نکلا تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کرو تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہیں ہے۔ ؎

دوسرا واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اعلام النبوۃ میں لکھا ہے کہ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے از راہ شرارت اس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت کس غرض کیلئے اسے یہ مشورہ دے رہے ہیں وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا سارا حال آپ سے بیان کیا۔ آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لیکر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزیدار جھڑپ کی امید کر رہے تھے مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے ہو۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائیگا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ ؎

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مسجد حرام میں تشریف فرما تھے کہ بنی زبید کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا قریش کے لوگو، تمہارے ہاں کون تجارتی مال

لانے کی ہمت کرے گا جب کہ باہر سے آئے ہوؤں کو تم لوگ لوٹ لیتے ہو؟ حضورؐ نے پوچھا تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا ابوالحکم (یعنی ابوجہل) نے۔ اس نے میرے سو بہترین اونٹ خریدنے کی خواہش کی اور ان کی قیمت بہت کم لگائی۔ اب اس کے مقابلہ میں کوئی شخص ان اونٹوں کو اس کی لگائی ہوئی قیمت سے زیادہ پر خریدنے کیلئے تیار نہیں ہے اور اس قیمت پر بیچ دوں تو سخت نقصان اٹھاؤں۔ حضورؐ نے اس سے تینوں اونٹ خود خرید لئے۔ ابوجہل دور بیٹھا ہوا خاموشی سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا حضورؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: خبردار جو پھر تم نے کسی کے ساتھ ایسی حرکت کی جو اس غریب بدو کے ساتھ کی ہے ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ وہ کہنے لگا، آئندہ میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ اس پر امیہ بن خلف اور دوسرے مشرکین جو وہاں موجود تھے ابوجہل کو شرم دلانے لگے کہ تم نے محمدؐ کے سامنے ایسی کمزوری دکھائی کہ شبہ ہوتا ہے، شاید تم ان کی پیروی اختیار کرنے والے ہو۔ اس نے کہا بخدا میں ان کی کبھی پیروی نہ کروں گا مگر میں نے دیکھا کہ ان کے دائیں اور بائیں کچھ نیزہ بردار کھڑے ہیں اور میں ڈرا کہ میں نے محمدؐ کے حکم کی ذرا سرتابی کی تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔(۱)

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی مظلومانہ زندگی میں بھی ظلم کے خلاف جدوجہد جاری رکھی اور کار دعوت کی ذمہ داری کی انجام دہی کے ساتھ ظلم کے خلاف صف آرا بھی رہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال سر اٹھا سکتا ہے کہ ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد یقیناً ناگزیر ہے اور انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عدل و قسط قائم کریں لیکن یہ مقصد اقامت دین یا اعلائے کلمۃ اللہ کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ معاشرتی مسائل میں ظلم و جبر کا رویہ دراصل انسانی حاکمیت کا ایک نتیجہ ہے جو الٰہی قوانین کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں نکلتا ہے اور جب تک پورے معاشرے میں قرآن کی حکومت قائم نہ ہو جائے اور زندگی کا ہر شعبہ اللہ کیلئے

خالص نہ ہو عدل کا قیام ناممکن ہے اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ اصل زور کفر و شرک کے خود ساختہ نظام کی بیخ کنی پر صرف ہو اور جزوی مسائل میں الجھ کر اپنی توجہ منقسم نہ کی جائے۔ اس طرح کی فکر رکھنے والے سیرت طیبہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز ایمان و عقیدہ سے کیا اور مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں اسی کی دعوت دیتے رہے۔ آپ نے عربوں کی اصلاح اخلاق، تزکیہ نفوس یا تعمیر معاشرہ کیلئے کوئی اصلاحی تنظیم قائم نہ کی۔ آپ نے انہیں متحد کرنے کیلئے کوئی قومی نعرہ اختیار نہ کیا بلکہ مکی زندگی میں صرف عقیدہ پر اپنی ساری بحث کو مرکوز رکھا اور نظام زندگی کی ان تفصیلات کو نہ چھیڑا جو اس عقیدہ کے تقاضے کے طور پر مرتب ہوتی ہیں؟

یہ سوال دراصل ایک غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ خدا کی طرف دعوت نہ دے کر جزوی مسائل کی طرف انسانوں کو متوجہ کرنا بلاشبہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن اس طریقہ کار کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان و عقیدہ سے صرف نظر کر کے اخلاقیات اور دوسرے مسائل سے تعرض کرنا غلط ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ: ۱۹)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں (۱۹)

لیکن ایمان و عقیدہ اور نظام اسلامی کی دعوت دینے کے ساتھ ان معاشرتی معاملات سے تعرض کرنا اور مخاطب قوم کے ان مسائل سے بحث کرنا جو اس کیلئے فوری توجہ کا مستحق ہے۔ نہ صرف اسلام کے خلاف نہیں بلکہ قرآن کی حکمت تبلیغ

یہ شامل ہے کہ کوئی قوم ظلم و جبر کی چکی میں پس رہی ہے، دو ظالموں نے اس کا جینا حرام کر دیا ہے، اور اس کا حق خود ارادیت چھین لیا ہے تو اس کی آزادی کے مسائل پر سوچے بغیر سے دین کی دعوت دینا کہاں تک بار آور ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی فرد بھوک سے بلک رہا ہے اور اس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں تو اسے دین کی دعوت دینے سے پہلے اس کی حیات کی بقا کا سامان کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی معاشرہ چھوت چھات اور پنچ نیچ اور نسلی امتیاز کا اس طرح شکار ہے کہ اس کے بعض افراد اس لئے تہ تیغ کر دیئے جائیں کہ انہوں نے اونچی ذات کے کنویں سے پانی کیوں بھر لیا تھا تو دین کی دعوت دینے کے ساتھ ان معاشرتی مسائل کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے گا؟ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان توحید کی دعوت کو سمجھنے کیلئے تیار اسی وقت ہو گا جب کہ دنیوی مسائل کا حل بھی اسے نظر آتا ہو اور اس نئے نظریۂ زندگی کا ساتھ اسی وقت دے گا جب کہ وہ اس پریشانی سے نکلنے کے سلسلہ میں پر امید ہو جس نے اس کی جان ختنی میں ڈال دی ہے۔

قرآن نے امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا ہے اور اس کی صفت اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ بیان کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہے اور بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ اسے معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ جو وہ اپنی قوت سے اور اپنے اسباب و وسائل سے تمام نوع بشری کی نجات کیلئے کوشش کرے۔ انسانیت کے راستے سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اس کی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی میں حائل ہوں اور ظلم و عدوان، بدی و شرارت، غلامی و مجبوری اور فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک جنگ برپا کرتی رہے جب تک یہ شیطانی قوتیں دنیا میں باقی ہیں۔ "معروف" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی ہو اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ فعل لیا جاتا ہے جس سے عقل صحیح آشنا ہو، جس کی خوبی کو فطرت سلیمہ جانتی اور سمجھتی ہو اور جسے دیکھ کر ہر انسان کا دل گواہی دے کہ واقعی وہ بھلائی ہے۔ اس کے بالمقابل

"منکر" کا لفظ ہے جو عربی لغت میں ان جانی اور نامانوس چیز کیلئے بولا جاتا ہے اور اصطلاحاً اس کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جس کو فطرت سلیمہ پسند نہ کرتی ہو، عقل صحیح جس کی برائی کا حکم لگائے اور عام انسان جسے ناپسندیدہ سمجھتے ہوں۔ ایمانداری سچائی، راست بازی، پرہیزگاری، فرض شناسی، ضعیفوں کی حفاظت، مصیبت زدوں سے ہمدردی، مظلوموں کی مدد، محتاجوں کی اعانت، عدل و انصاف کا قیام، خدا اور بندوں کے اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور انہیں ادا کرنا، یہ اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل معروف ہیں۔ ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام امر بالمعروف ہے۔ اس کے برعکس خیانت، بدکاری، دروغ بافی، فتنہ پردازی، فساد انگیزی، بے انصافی، اپنے حدود سے تجاوز کرنا اور دوسروں کے حق مارنا، باطل کی حمایت کرنا، حق و صداقت کو دبانا، کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا، یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلاف انسانیت، خلاف عقل اور خلاف فطرت اعمال منکر ہیں اور ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا نہی عن المنکر ہے۔[۴۳]

اگر ایک داعی دین اپنے گھر کی آگ بجھانے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی مدافعت کرنے میں مستعد ہے تو اس کا دینی فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کا گھر جلتا دیکھ کر اور دوسرے کے حقوق کی پامالی ہوتے اور دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں دیکھ کر بے چین ہو جائے کیونکہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری کے ساتھ دوسروں کی حفاظت و حمایت کا بھی وہ ذمہ دار ہے اگر کوئی قوم اپنا گھر بچانے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے سے بدی و شرارت کو دفع کرنے کیلئے ہمہ تن تیار ہو لیکن جب دوسری قوموں پر ظلم و استحصال کا حملہ ہو، دوسری قومیں شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ و برباد ہو رہی ہوں اور دوسری قوموں کی مادی زندگی تباہ ہو رہی ہو اور وہ ان کی آزادی اور صلاح و فلاح کیلئے کوشش کرنے سے انکار کر دے تو یہ اس کی خود غرضی کی انتہا ہو گی۔ مسلمان تو برپا ہی دوسرے لوگوں کی نجات اور فلاح کیلئے کیا گیا ہے اور قرآن نے اس کی ذمہ داری ہی یہ قرار دی ہے کہ وہ

وہ سب کے دکھ درد میں شریک ہو اور ساری قوموں کیلئے درماں ہے اب اگر وہ دعوت و تبلیغ میں لگا رہے اور ان کے مسائل سے دلچسپی نہ لے تو اپنی بنیادی ذمہ داری وہ کس طرح پوری کر سکتا ہے!

دین کے اس مزاج کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی ان آیات کا مطالعہ کیجئے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ظلم کے خلاف جدوجہد کی یہ تحریک مکہ ہی سے شروع ہو چکی تھی اور اس سلسلہ کی اصولی ہدایات تحریک اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں دی جا چکی تھیں[۲۳] سورہ نحل کی مندرجہ ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ	اللہ عدل اور احسان اور صلہ
وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ	رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و
ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ	بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ	منع کرتا ہے وہ تمہیں نصیحت
وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ	کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔
تَذَكَّرُونَ. (۹۰)	

قرآن نے اس امر کا اعلان کیا کہ عدل و قسط کے قیام کیلئے ظلم کا استیصال کرنا ضروری ہے اور جو لوگ اہل ایمان ہیں ان کی صفت یہ بتائی کہ وہ مظالم کے مقابلہ میں سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا	سوائے ان کے جو ایمان لائیں
الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ	اور نیک عمل کریں اور اللہ کو یاد
كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ	کریں بہت زیادہ اور وہ مقابلہ
مَا ظُلِمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ	کیلئے سینہ سپر ہو جائیں اس کے پیچھے
ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ	کہ انہیں ظلم کا نشانہ بنایا گیا اور
يَنْقَلِبُونَ (شعراء ۲۲۷)	ضرور جلد پتہ لگ جائیگا ان لوگوں کو

جنہوں نے ظلم کی روش اپنائی وہ کیسی پلٹیاں کھاتے ہیں؟

جہاں قرآن پاک نے ایمان، عمل صالح، ذکر خداوندی کے ساتھ ظلم کا مقابلہ کرنے کی صفت بھی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے اندر ایمان جلوہ گر ہوگا، جو عمل صالح کی نعمت سے فیضیاب ہوگا اور ذکر خداوندی میں لطف پائیگا وہ ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا؟ یہ چاروں صفات یک وقت بیان کر کے قرآن یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ظلم کے خلاف جدوجہد ایمان کا ناگزیر جزو ہے۔

ایک دوسری جگہ مسلمانوں کی صفت ہی یہ بتائی گئی کہ وہ ظالموں اور جابروں کیلئے نرم چارہ نہیں ثابت ہوتے بلکہ جب کوئی طاقت اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرتا ہے تو وہ اس کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں اور ہتھیار نہیں ڈالتے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ	اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے
الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ وَجَزَاءُ	تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی
سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا	کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو
فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ	معاف کر دے اور اصلاح کرے
عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ	اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ
الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ	ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور
بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ	جو ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان
مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ	کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔

(شوریٰ: ۳۹-۴۱)

اس آیت کی تفسیر میں صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ امام نخعیؒ جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو فرماتے صحابہ اس امر کو ناپسند کرتے تھے کہ ان سے کسی کمزوری کا اظہار ہو اور فاسق ان کے خلاف دلیر ہو جائیں۔ انہوں نے سوال اٹھایا کہ انتقام لینے پر کیا اہل ایمان قابل تعریف ہیں؟ پھر اس کا اثبات میں جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص انتقام لیتے وقت حدود الٰہی کی پاسداری کرے وہ اطاعت گذار ہے اور ہر اطاعت گذار قابل تعریف اور محمود ہے۔[۲۵]

ان آیات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مظالم کے خلاف جدوجہد کی تعلیم مدنی دور ہی کی خصوصیت نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اسلام کے مکی دور سے ہی اس کی شروعات ہو چکی تھی اور اس سلسلہ کی بنیادی ہدایات مکہ کے مظلومانہ دور ہی میں دی جا چکی تھیں اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کی اجتماعی ہدایات مدنی زندگی کی پیداوار ہیں اور مسلمانوں کی مکی زندگی ان امور سے ناآشنا تھی۔

۱۳۔۔۔ یہ پورا واقعہ مولانا مودودیؒ کی سیرت سرور عالم حصہ دوم ص ۱۰۰ سے ماخوذ ہے

۱۴۔۔۔ دیکھئے، مولانا مودودیؒ، تلخیص تفہیم القرآن ص ۱۰۱۹

۱۵۔۔۔ یہ الفاظ حضرت ربعی بن عامرؓ کی اس تقریر سے ماخوذ ہیں جو آپ نے ایرانی سپہ سالار رستم کے پرشکوہ دربار میں کی تھی۔ جب لوگوں نے آپ سے آمد کی وجہ پوچھی تو فرمایا جئنا لنخرج من شاء الله منکم من عبادۃ العباد الی عبادۃ الله، من ضیق الدنیا الی سعۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام۔

یعنی ہم اس لئے آئے ہیں کہ جس کو اللہ توفیق دے اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں اور دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔

۱۶۔۔۔ قرآن نے مظلومی و مجبوری کے اس دور کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَا
فُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ
وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (الانفال: ۲۶)

ترجمہ: "یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے سے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کر دیئے اور تمہیں اچھا رزق بہم پہنچایا شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

یہاں اشارہ مکہ کی مظلومی و بے بسی کی زندگی کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ تم ابتدا میں تھوڑے تھے اور بے زور تھے ہر طرف سے ظلم و ستم کا سامنا تھا اپنے اور غیر سب تم کو فتنہ میں مبتلا کئے ہوئے تھے اور تمہیں خدشہ تھا کہ قریش تمہیں نیست و نابود کر دیں لیکن خدا نے مدینہ میں تمہیں پناہ دی اور پاکیزہ معاش و معیشت کے دروازے تم پر وا کئے اس کا تقاضا ہے کہ تم خدا کے شکر گزار اور اس کے دین کے کارگزار بندے بنو۔

۱۷۔۔۔ بلاذری، انساب الاشراف، الجزء الاول، تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، دارالمعارف مصر ص ۱۲۸ - ۱۲۹ - ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید دارالفکر ۱۹۳۷ء ۱ / ۲۰۲ - ۲۱۴

۱۸۔۔۔ مولانا مودودیؒ، سیرت سرور عالم جلد دوم ص ۵۰۰ - ۵۰۶

۱۹۔۔۔ انساب الاشراف، حوالہ بالا، جلد اول ص ۲۰۰۔

۲۰۔۔۔ یعنی کسی زیارت گاہ کی سجادہ نشینی، مجاوری اور چند نمائشی مذہبی اعمال کی بجا آوری، جس پر دنیا کے سطح بین لوگ بالعموم شرف اور تقدس کا مدار رکھتے ہیں خدا کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ اصلی قدر و قیمت ایمان اور راہ خدا میں قربانی کی ہے۔ ان صفات کا جو شخص بھی حامل ہو وہ قیمتی آدمی ہے خواہ وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اور کسی قسم کے امتیازی طرے اس کو لگے ہوئے نہ ہوں لیکن جو لوگ ان صفات سے خالی ہیں وہ محض اس لئے کہ بزرگ زادے ہیں، سجادہ نشینی ان کے خاندان میں مدتوں سے چلی آ رہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی مراسم کی نمائش وہ بڑی شان کے ساتھ کر دیا کرتے ہیں وہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت موروثی حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی ادارے ان نالائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دیئے جائیں۔

(مولانا مودودیؒ، تلخیص تفہیم القرآن ص ۳۰۹ ملخصاً)

نگی حسن متعلم حزب پنجم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریۂ اخلاق

حذف و اضافے کے ساتھ عربی سے اُردو میں ترجمہ۔

اس دنیائے بے ثبات میں نہ جانے کتنی سعید روحوں نے پیکر انسانی میں اخلاقی نمونہ پیش کیا ہے۔ ابتدائے آفرینش ہی سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا جسمیں کچھ پاکیزہ اور سعید روحوں نے اخلاق کو نظریاتی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اہل دنیا کے سامنے پیش نہ کیا ہو، البتہ اس سلسلے میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن کارہائے نمایاں کو انجام دیا تاریخ انھیں تاقیامت فراموش نہ کر سکے گی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے سامنے ایسے بلند اور اعلیٰ اخلاق پیش کیے جن سے انکے دلوں پر بے حد اثر پڑا اور ان میں سے بہتوں کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں حتیٰ کہ ایک کٹر یہودی دشمن جو روزانہ آپکے جسم اطہر پر کوڑا پھینکا کرتا تھا آپکے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ نے اپنے عملی اخلاق ہی کے سہارے چند دنوں میں اپنے ارد گرد پروانوں کو جمع کر دیا جو ہمہ وقت اللہ کے دین کی سرفرازی کی خاطر جام شہادت نوش کرنے کیلئے بے چین رہتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ چند ہی دنوں میں پورے عالم عرب میں ہلال اسلام بدر کامل بن گیا۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کیلئے مربی بنا کر بھیجے گئے تھے، اسلئے آپ تمام انسانوں کی تربیت اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کرنا چاہتے تھے۔ آپکی تربیت ایسے نظریات واقوال سے یکسر مختلف تھی جنکا نفاذ عملی زندگی میں محال اور ناممکن ہو، جیسا کہ بیشتر قدیم

وجدید تربیتی نظریات کا حال ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ایک خالص اور حقیقی تربیت تھی جو اقوال و آراء تک محدود ہونے کے بجائے، بدرجۂ اولیٰ آپکے سلوک، برتاؤ اور عملی تصرفات میں پائی جاتی تھی۔ اسلئے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً تربیت نبوی اور اخلاقی نظریات پر غور و فکر کرتے رہیں تاکہ ہم توشۂ اخلاق سے اپنے دامن کو بھر لیں اور ویسی سیدھی شاہ راہ کو پا سکیں جسکی ہمیں آج کی مضطرب دنیا میں سخت ضرورت ہے اور تاکہ یہ ایسے سامراج اور عالمی صیہونیت کی جانب سے ہونے والے شر پسند حملوں کے خلاف ہمارا مضبوط سہارا ہو جائے، جنکا بنیادی مقصد عقیدۂ ربانی پر مشتمل اسلامی اخلاق کو پامال کرنا ہے

اخلاق کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

اخلاق جمع ہے خلق کی جسکے معنی ازروئے لغت خصلت و عادت کے ہوتے ہیں اور اصطلاح شرع میں اسکا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔

(۱) خلق کا اطلاق ہر اس صفت پر ہوتا ہے جو کسی کے اندر اتنی وافر مقدار میں پائی جائے کہ اسکی فطرت بن جائے اور جس کے ذریعہ موصوف مدح یا ذم کا مستحق ہو۔ اس شرعی مفہوم کی تائید میں ایک حدیث آتی ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاشج عبد القیس: إن فیک لخلقین یحبهما اللہ، الحلم والاناۃ، قال یا رسول اللہ، أخلقین تخلقت بهما أم جبلت علیهما؟ فقال: بل جبلت علیهما، قال الحمد للہ الذی جبلنی علی خلقین یحبهما اللہ" (رواہ مسلم) "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبد قیس سے کہا کہ تمہارے اندر دو ایسی عادتیں پائی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حد محبوب ہیں اور وہ ہیں حلم و وقار، انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول کیا ان دونوں خصلتوں سے میں خود متصف ہوا ہوں یا انھیں میری فطرت میں رکھ دیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلکہ یہ دونوں تمہاری فطرت میں رکھ دی گئی ہیں (یہ سنکر) انھوں نے کہا: ساری تعریف اس اللہ کیلئے ہے جسنے میرے اندر دو ایسی عادتیں رکھ دی ہیں جنھیں وہ پسند کرتا ہے۔

(۲) خلق کا اطلاق احکام شریعت اور اسکے آداب سے گہری وابستگی پر بھی ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "البر حسن الخلق" (رواہ الترمذی) بھلائی بہترین عادت ہے

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کی آیت "وانک لعلی خلق عظیم" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا تھا "کان خلقہ القرآن" (رواہ احمد و ابو داؤد) آپکی خصلت سراپا قرآن تھی۔

اخلاق نبوی قرآن کی روشنی میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے جمیع مراحل میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وہ کامل شخصیت تھی جسکے اندر مدح وثناء کی وہ تمام صفتیں پائی جاتی تھیں جو بہت سے لوگوں میں متفرق طور پہ پائی جاتی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپکو پوری نوع انسانی کیلئے نجات دہندہ بنا کر بھیجا تھا۔ اتنی عظیم ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے تو ایسے ہی بلند اخلاق اور صفاتِ حسنہ کی ضرورت تھی۔

اور شاید یہ شرف جس سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو نوازا گیا رسالت و پیغمبری کا شرف تھا یقیناً رسالت ایک وہبی شے ہے اور اللہ کی جانب سے ایک عظیم فضل ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ بیشک اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید کی متعدد آیات میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ جمیلہ کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے کچھ نمونے کی آیتیں مع مختصر تفسیر کے نیچے لکھی جاتی ہیں۔

نٓ والقلم وما یسطرون ○ ما انت بنعمۃ ربک بمجنون ○ وان لک لاجراً غیر ممنون ○ وانک لعلی خلق عظیم ○

ن شاہد ہے قلم اور وہ کتاب جسے کاتبین وحی (مراد قرآن) لکھ رہے ہیں، تم اپنے رب کی نعمت کی وجہ سے دیوانہ نہیں ہو اور تمہارے لئے بے حساب اور لازوال اجر ہے اور تم عظیم اخلاق پر فائز ہو۔

(سورۂ قلم، ۱تا۴)

اس آیت میں یہ بات بتائی گئی کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی مجنون اور دیوانہ نہیں ہیں جیسا کہ نقاد کہتے ہیں اور نہ ہی آپ اخلاقی معیار سے نیچے ہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل ہیں۔ آپ کی

رفعت وبلندی اور ارفعیت ہے اور اس بات کی تین چیزوں کے ذریعہ تاکید کی گئی۔ قلم اور قرآن کی قسم کھا کر، اِنَّ سے جملے کا آغاز کر کے، اور خبر پر لام تاکید داخل کر کے۔ یہ تمام کے تمام تاکید کلام کیلئے آتے ہیں۔

والنجم اذا ھوی ○ ما ضل صاحبکم وما غوی ○ وما ینطق عن الھوی ○ ان ھو الا وحی یوحی ○ (سورہ نجم، ۱تا۴)

شاہد ہے تارا جبکہ وہ ڈوبنے لگا۔ تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

یہ آیت صاف طور سے بتاتی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر نصیحت، خیر خواہی، امانت اور رشد و ہدایت کے مطابق فریضۂ رسالت کی ادائیگی کا جذبہ کافی مقدار میں کارفرما تھا۔ آپ ضلالت و گمراہی سے کافی دور تھے اور آپ کی زبان مبارک سے حق بات کے سوا کچھ نہیں نکلتا تھا۔

وما ھو علی الغیب بضنین ○

اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہے۔

(سورہ تکویر ۔ ۲۴)

یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم غیب کو چھپاتے نہیں ہیں بلکہ ان کے جو حقائق آپ کے سامنے کھولے جاتے ہیں انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے کم وکاست بیان کر دیتے ہیں۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف رحیم ○

(سورہ توبہ ۔ ۱۲۸)

تمہارے پاس خود تمہاری ہی میں سے ایک رسول آگیا، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق و رحیم ہے۔

..... الذین یتبعون الرسول الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ (سورہ اعراف ۔ ۱۵۷)

جو اس پیغمبر نبی امی صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، جو انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندشوں کو کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك
(سورہ آل عمران ۔ ۱۵۹)

اللہ کی رحمت ہی کی وجہ سے تم نرم پڑ گئے ہو اور اگر تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سارے کے سارے تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔

مذکورہ بالا تمام آیتیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صفت رحمت و رافت اور نصح و خیر خواہی کا پتہ دیتی ہیں۔

اخلاقِ رسول ؐ کے درخشاں پہلو

اس ہادی اعظم اور محسنِ انسانیت کے اخلاق بیان کرتے ہوئے میرا دل لرزاں و ترساں ہے جس کے وجود میں آتے ہی گمراہی کی جڑوں پر آگ لگ گئی اور ہدایت کا ستارہ انقلاب کے جھروکے سے جھانک رہا ہے۔ اگر کوئی قلم کار اس انسانِ کامل کی تعریف میں سیکڑوں صفحات بھی سیاہ کر دے پھر بھی تعریف ادھوری ہی رہ جائے گی۔ تو پھر مجھ ناچیز کے اس مختصر سے مقالے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اخلاقِ نبوی کے تمام اجزا مکمل کر سامنے آجائیں۔ البتہ میں اپنی حسبِ وسعت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے چند درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ جود و کرم

تاریخ کے روشن ورق یہ بات بشارت دیتے ہیں کہ روزِ ازل سے اب تک اس دھرتی پر کسی ایسے انسان نے جنم نہیں لیا جس کی سخاوت جود و سخا میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے علی مرتبت ہو سکی ہو، اور نہ ہی تا قیامت کوئی انسان اس میں آپ کا ثانی ہو سکے گا۔ آپ کے دامانِ کرم کی وسعت کے سامنے سمندر بھی ہیچ ہے۔ ایک شاعر نے اس حقیقت کی تعبیر کتنے خوش انداز میں بیان کی ہے ؎

اللہ رے وسعت ترے دامانِ کرم کی
اس بحر کا ملتا نہیں ڈھونڈے سے کنارا

آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سخاوت کی تمام تر شکلوں سے بھری پڑی ہے چاہے وہ مالی سخاوت ہو یا دعوت الی اللہ اور جاہ و منزلت کی۔ آپ کی اپنی مبارک جان کے ذریعہ سخاوت کا تصور ہم ان غزوات سے کر سکتے ہیں جن میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے دشمنوں سے جنگ کی۔ یہاں تک کہ ان میں سے بیشتر میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک زخموں سے لہو لہان ہو گیا اور چہرۂ مبارک پر زخموں کے نشانات پڑ گئے۔ لیکن پھر بھی وہ محسنِ انسانیت دعوتِ الٰہی کے

عظیم ترین ذمہ داری سے دست بردار ہونے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوا۔ کانٹوں کا جواب پھولوں سے، گالیوں کا جواب دعاؤں سے، اور ترش روئی کا جواب مسکراہٹ سے دیتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مال کے ذریعہ بھی سخاوت کی۔ زندگی میں کبھی بھی آپ کی رغبت مال کی طرف نہیں ہوئی اور نہ ہی آپ نے کبھی کسی سائل کو لوٹایا۔ ترمذی شریف کی ایک مشہور حدیث ہے:

قد جاءت النبي صلى الله عليه وسلم امرأة ببردة منسوجة فقالت نسجتها لاكسوكها فأخذها النبي صلى الله عليه وسلم محتاجا اليها ولبسها، فقال له رجل من الصحابة اكسنيها يا رسول الله فقال صلى الله عليه وسلم نعم، فدخل منزله فطواها وبعث بها اليه فقال له بعض الصحابة ما احسنت... لبسها رسول الله صلى الله عليه وسلم محتاجا اليها ثم سألته وعلمت انه لا يرد سائلا، فقال اني والله ما سألته لالبسها انما سألته لتكون كفني قال سهل بن سعد رضي الله عنه فكانت كفنه۔

ایک مرتبہ ایک عورت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بُنی ہوئی چادر لے کر آئی اور کہا کہ میں نے یہ چادر آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے بُنی ہے۔ چنانچہ آپ نے اسے لیا اور پہن لی کیونکہ اس وقت آپ کو اس کی ضرورت تھی۔ پھر ایک صحابی نے آپ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول یہ مجھے پہنا دیجئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ پھر آپ اپنے گھر گئے اور اس چادر کو لپیٹ کر ان کے پاس بھجوا دیا۔ اس پر کسی صحابی نے ان سے کہا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسے پہنے ہوئے تھے، حالانکہ آپ کو اس کی سخت ضرورت تھی پھر تم نے اسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مانگ لیا جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ آپ کسی سائل کو واپس نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ بخدا میں نے اسے پہننے کیلئے نہیں مانگی تھی بلکہ صرف اس لئے مانگی تھی کہ میرا کفن ہو جائے۔ سہل بن سعد ؓ فرماتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد وہ چادر ان کا کفن بنی۔

دعوت الی اللہ میں آپ کی سخاوت اس پہلو سے نمایاں ہوتی ہے کہ آپ کی محبت اپنی امت سے اور اسی طرح تمام انسانوں سے آپ پر فرض کرتی تھی کہ آپ تمام نوعِ انسانی تک ان کی دنیا و آخرت دونوں میں سعادت مندی کے لئے اپنی دعوت کو پہنچا دیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی جاہ و منزلت کے ذریعہ بھی سخاوت

کی۔ آپ نے سچ فرمایا تھا:

لکل نبی دعوة مستجابة فدعا بها فاستجیب له فجعلت دعوتی شفاعة لامتی یوم القیامة۔
(رواہ مسلم)

ہر نبی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ دعا کرے جسے بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل ہو پھر انھوں نے دعا کی اور اسے قبول کر لیا گیا البتہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے قیامت کے دن اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی۔

یہ حدیث صاف صاف بتاتی ہے کہ نبی کریمؐ نے اپنی جاہ و منزلت سے بھی اپنی امت ہی کو فائدہ پہونچایا۔ اپنے لئے کچھ نہیں کیا جب کہ اگر آپ چاہتے تو مال و زر کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ آپ کا یہ ارشاد اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ آپ کو اپنی امت سے بے حد محبت تھی۔

۲- عفو و درگزر

جس طرح سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جود و سخا اور ایثار و قربانی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اسی طرح سے عفو و درگزر حلم و وقار اور صبر و تحمل جیسی عظیم صفتیں بھی آپ کے اندر حد کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ آپ کی پوری سیرت ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو ان مذکورہ صفات کی غماز ہیں۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت منقول ہے انھوں نے کہا:

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بین امرین الا اخذ ایسرهما ما لم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منه وما انتقم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لنفسه الا ان تنتهك حرمة اللہ فینتقم للہ بها۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دو امور میں سے سب سے آسان کو اختیار کرتے جب تک کہ اس میں گناہ کا خدشہ نہ ہوتا اور اگر اس میں گناہ ہوتا تو آپ اس سے بے حد دور رہتے اور آپ نے کبھی کسی سے اپنے لئے بدلہ نہیں لیا۔ ہاں اگر حرمت اللہ کو پامال کیا جاتا تو اللہ کے لئے آپ اس کا بدلہ لیتے۔

اسی طرح سے صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور روایت ملتی ہے وہ فرماتی ہیں:

دخل رهط من الیهود علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقالوا

ایک مرتبہ یہود کے چند افراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: السام علیکم

السام علیکم، قالت عائشة ففهمتها فقلت وعلیکم السام واللعنة، قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مهلاً یا عائشة ان اللہ یحب الرفق فی الامر کله فقلت یا رسول اللہ الم تسمع ما قالوا؟ قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قد قلت وعلیکم۔

(تم پر ہلاکت ہو) عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اسے سمجھ گئی اور کہا ہلاکت اور اللہ کی لعنت تم پر ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ نبی کریمؐ نے کہا اے عائشہ ٹھہرو یعنی اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتا ہے میں نے کہا اے اللہ کے رسول کیا آپ نے ان کی بات نہیں سنی؟ آپ نے فرمایا "میں" وعلیکم" کہہ چکا ہوں۔

۳- رحمت و شفقت

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم صفت رحمت و شفقت سے اس طرح متصف تھے کہ اسے سمجھنے کے لئے انسانی عقل حیران ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کلام پاک میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہا ہے:

وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمین۔
(سورۂ انبیاء ۱۰۷)

اور ہم نے آپ کو سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فبما رحمة من اللہ لنت لهم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولك۔
(سورہ آل عمران ۱۵۹)

اللہ کی رحمت ہی کی وجہ سے تم ان پر نرم پڑ گئے ہو اور اگر تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب کے سب آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔

اسی طرح سے حدیث شریف میں آپ کی رحمت و شفقت کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ صحیحین میں عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یدع العمل وهو یحب ان یعمل به خشیة ان یعمل به الناس فیفرض علیهم۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک کام کرنا چاہتے تھے لیکن اس ڈر سے نہیں کرتے تھے کہ کہیں اسے دوسرے لوگ نہ کرنے لگیں پھر وہ ان پر فرض ہو جائے۔

انس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

ما صلیت وراء امام قط اخف صلوٰة

میں نے کسی بھی امام کے پیچھے نبی صلے اللہ علیہ وسلم

ولا اتم من النبي صلی اللہ علیہ وسلم وانہ کان لیسمع بکاء الصبی فیخفف مخافۃ ان تفتن امہ۔

سے زیادہ ہلکی اور کامل نماز نہیں پڑھی اور جب کبھی آپ بچے کے رونے کی آواز سنتے تو اس ڈر سے نماز کو خفیف کر دیتے کہ اس کی ماں فتنے میں نہ پڑ جائے

ابو ہریرہؓ سے صحیحین میں یہ روایت منقول ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوۃ۔

اگر میں اپنی امت کے لئے مسواک کو دشوار نہ سمجھتا تو انہیں ہر وضو کے وقت اس کے کرنے کا حکم دے دیتا۔

مذکورہ بالا احادیث شریفہ اور ان کے علاوہ دوسری بہت سی حدیثیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صفت رحمت و شفقت کو اجاگر کرتی ہیں۔

۴- شجاعت و بہادری

عربوں کی شجاعت و بہادری ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جو معمولی سی باتوں پر ان کے درمیان جنگ کا چھڑ جانا اور برسہا برس قائم رہنا ان کی شجاعت کا بڑا ہی ثبوت ہے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم بھی عربی النسل تھے۔ ایک نبی اور رسول ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جسمانی اور روحانی دونوں قوتوں سے نوازا تھا اور آپؐ نے اپنے رب کی اس عظیم نعمت کی شکر گزاری اس طرح سے کی کہ آپؐ نے اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی عبادت و پرستش اور اس کے پیغام کی نشر و اشاعت میں کی۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن القوی خیر و احب الی اللہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر۔

طاقتور مومن ضعیف مومن کی نسبت ہر خیر کا میں اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر اور محبوب ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد فی سبیل اللہ میں اپنے اصحاب سے مقدم رہتے تھے۔ جنگ احد میں شہادت حق کی خاطر آپ بہت ہی شجاعت و بہادری کے ساتھ دشمنوں کی یورش کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کا چہرۂ مبارک خون سے لت پت ہو گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے لیکن اللہ تعالے کی ذات پر توکل کرتے ہوئے اور ثابت قدمی کے ساتھ ان سے لڑتے ہوئے اسلام کی بقا کے لئے ایک لمحہ فروگذاشت نہیں کیا۔

۵- تواضع وانکساری

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی تواضع و انکساری کی زندگی تھی۔ آپؐ کے اقوال و اعمال اور عادات و اطوار سے کبر و پندار کی جھلک بھی نہیں ملتی۔ باوجود اس کے کہ آپ کمال انسانیت کے حد اعلیٰ کو پہنچے ہوئے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو چند خصائص نفس کے ذریعہ خاص کر دیا ہے اور چند نمایاں اوصاف کے ذریعہ دنیا اور آخرت میں دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو افضل المرسلین اور خاتم النبیین بنا کر بھیجا اور آپ ہی کو تمام انبیاء کا سردار اور پیشوا بنایا۔ نیز اللہ تعالیٰ آپ ہی کو سب سے پہلے زمین سے نکالے گا اور شفاعت کی اجازت دے گا۔

آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بھی صفت تواضع سے آراستہ ہونے پر ابھارا آپؐ نے ارشاد فرمایا:

وما تواضع احد للہ الا رفعہ اللہ۔ (رواہ مسلم)

جو اللہ تعالے کے سامنے جھک گیا اللہ تعالیٰ نے اس کے درجے کو بلند کر دیا۔

صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین فما قال لی: اف ولا لم صنعت؟ ولا الا صنعت

میں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی لیکن آپؐ نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ اُف تو نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا؟

۶- دعوتِ دین میں نصح اور خیر خواہی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جود و کرم، تواضع و انکساری، شجاعت و بہادری، شفقت و رحمت، عفو و درگزر، اور اسی طرح سے دوسرے تمام بہترین عادات و اطوار سے مزین تھے۔ آپؐ کی یہ صفات ہمارے سامنے نمایاں طور سے اس وقت مترشح ہوتی ہیں جب کہ ہم آپؐ کی دعوتی و تبلیغی زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رسالت کی اتنی عظیم ذمہ داری کو کیسے انجام دیا جس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ اور کیا آپ نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ آپؐ نے لوگوں کو چند سالوں کے اندر

بنے ایسا ایسی روشن شاہراہ تک پہونچا دیا جس کی رات مانند نہار ہے اور جس سے صرف وہی شخص بھٹک سکتا ہے جس کے لئے تباہی و بربادی مقدر ہو چکی ہو۔ دراصل یہ سب کچھ اس بات کا نتیجہ ہے کہ آپ کمال نصح و خیر خواہی اور قوت بیان سے متصف تھے۔ انتہائی درجہ کے امین تھے۔

خاتمہ

یہ ہمارے رسول اور نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے چند درخشاں پہلو تھے جن کو میں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، اس لوح قرطاس پر رقم کر دیا ہے۔ ویسے ان میں بہت زیادہ تشنگی پائی جاتی ہے کیونکہ آپ کے جمیع اخلاق کو گنتی کے ان چند صفحات میں بیان کرنا ممکن ہے۔ میں مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس دنیا میں پر آنکھ کھولنے سے لے کر حرکت قلب کے بند ہو جانے تک ہر بہترین عادت سے آراستہ رہے اور ہر مذموم چیز سے بچتے رہے اور اب آپ ہی کی زندگی تمام افراد انسانی کی فلاح و کامرانی کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے جو دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کی زندگی کو اپنے لئے اسوہ اور نمونہ بنائے اور آپ کے بتائے ہوئے نظریۂ اخلاق کا باریک بینی سے مطالعہ کرے نیز آپ کے اخلاق حسنہ کو حتی المقدور اپنی زندگی میں جاری و ساری کرے اس کے بغیر کسی کو عذاب الٰہی سے مفر نہیں۔ اللہ جل جلالہ حامی و ناصر ہو۔

(بقیہ، معاشرتی مسائل سے ...)

۲۱۔ قرآن کریم، آل عمران: ۱۱۰؛ حج: ۴۱

۲۲۔ دیکھئے آل عمران: ۱۱۰؛ بقرہ: ۱۴۳؛ حج: ۷۸

۲۳۔ مولانا مودودیؒ، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۱ء ص ۹۲،۹۳
تفصیل کیلئے مولانا سید جلال الدین عمری کی معرکۃ الآرا تصنیف معروف و منکر کا مطالعہ کیجئے۔

۲۴۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے مولانا سلطان احمد اصلاحی، قرآن مجید کی مکی سورتوں کے مضامین، تحقیقات اسلامی، جون مارچ ۱۹۸۶ء ص ۹۴-۹۰
نیز مولانا کا مضمون، مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار، زندگی نو جون، جولائی ۱۹۸۶ء۔

۲۵۔ زمخشری: الکشاف، الجزء الرابع، ترتیب و تقدیم مصطفےٰ حسین احمد، مطبعۃ الاستقامۃ قاہرہ ۱۹۵۳ء ص ۱۸۰

سید اسعد گیلانی

ماہر القادری

بھرپور زندگی۔ قابل رشک موت

زمین پر چلنے پھرنے والے انسان کی ایک آخری خبر آیا کرتی ہے جس کے بعد پھر اس کی کوئی خبر نہیں آتی بس تذکرے ہی رہ جاتے ہیں۔ یہ خبر کبھی غیر متوقع نہیں ہوتی لیکن انسان اسے غیر متوقع خبر کی حیثیت ہی سے قبول کرتا ہے اس لئے کہ کچھ اصول بھی جب منطبق ہوتے ہیں تو تلخ حقائق انسان کو رلا دیتے ہیں اور موت بھی انہی اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ جب وہ ہم سے دور ہٹ کر ہوتی رہتی ہے تو ہم تاسف و حسرت کے چند الفاظ کے ساتھ متاثرہ افراد سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور جب وہ ہمارے پہلو میں چھاپہ مارتی ہے تو ہم روتے اور دلاتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موت کا زخم سب سے پہلے مندمل ہوتا ہے اور انسان نے جس قدر موت کی کارروائیوں پر صبر کرنا سیکھا ہے کسی دوسری حریفانہ کارروائی پر اتنا صبر وہ کبھی نہیں کرتا۔ موت انسان کو عمل سے صبر سکھاتی اور صبر بعد عمل کی تربیت دیتی ہے۔ موت بھی نوع انسان کی مربی، مزکی اور استاد ہے۔ موت دنیا سے آخرت کی طرف جانے کے لئے انسان کی سواری ہے۔ یہ دنیا میں زندہ انسان کے آخری خبر ہے۔ ہم نے ماہر القادری کی بھی آخری خبر سن لی۔ جس دن یہ خبر سنی اس دن دل بجھا بجھا اور دماغ اُکھڑا اُکھڑا رہا۔ پھر حسب معمول دل و دماغ معمول پر آ گئے۔ انسان کی زندگی کیا ہے؟ روز مرہ کے معمولات۔ حوادث کی کوئی آندھی انسان کے ان معمولات کو تہس نہس بھی کر دے تو بھی یہ تغیر عارضی ہوتا ہے۔ وقت کے سمندر کی طرح سیاہ سینۂ انسانی زندگی کی کشتی کو ایک مدت تک یوں گود میں لئے ہلاتا رہتا ہے جیسے ماں بچے کو گود میں جھلاتی ہے۔ پھر ایک روز وقت کے سمندر کا سینہ یک لخت پھٹتا ہے اور انسانی زندگی کی کشتی اس کی تہ میں اس طرح سما جاتی ہے جیسے یہ پہلے موجود ہی نہ تھی۔ یوں انسانی زندگی کے ان گنت سفینے وقت کے سمندر کی تہ میں غرق ہوتے رہتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ آسمان کے تاروں کا جو حشر ہوتا ہے آمد اجل کے ساتھ زمین کے انسانوں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے۔ بس آسمان کے تارے مرگ انبوہ کا شکار ہوتے ہیں اس لئے ان کا کوئی غم نہیں کرتا اور زمین کا انسان جب ڈوبتا ہے اکیلا

ڈوبتا ہے اور ڈوبنے کے بعد حشر تک اس کی دوبارہ تابندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ماہر القادری آسمانِ دنیا کے درخشاں ستارے تھے جن کو اجل نے کراچی سے چلایا، جدہ پہنچایا تاکہ بیت اللہ شریف کے ہمسایہ میں اس مردِ خدا کو دنیا کی جبری مشقت سے نجات دلائی جائے تاکہ بیت اللہ شریف میں اس کا جنازہ ہو اور مکہ مکرمہ کے قبرستان میں اسے دفن کیا جائے۔ انسان کو جس مٹی کی خاک سے وجود عطا کیا گیا تھا شاید اسی لئے بالآخر انتقال کے وقت اسی جگہ کی خاک زور کرتی ہے جس جگہ کی خاک اس کے خمیر میں ڈالی ہوتی ہے۔ ماہر القادری نے زمین پر ایک بھرپور زندگی گزاری۔ مجلسی زندگی، دینی و اخلاقی زندگی، اسلامی زندگی، پرکیف و پرلطیف زندگی، مجاہدانہ و سپاہیانہ زندگی، ادیبانہ و شاعرانہ زندگی۔ ماہر صاحب جاندار اور بھرپور زندگی کے مالک تھے اور اس کو انھوں نے اس طرح استعمال کیا کہ ان کی دنیا قابلِ رشک بن گئی۔ ان کی زندگی گلزار و نگارش اور مجلس و محفل کی زندگی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پختہ مسلمان، باعمل اور خدا ترس انسان بھی تھے۔ اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی نہ صرف تسلیم ہی کرتے تھے بلکہ اس کے نفاذ کی جدوجہد میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے جب ایک بار توحید کے تقاضے سمجھ لئے تو پھر اسے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ جب مقامِ رسالت کو پہچان لیا تو پھر اس کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ بلاشبہ شعر و شاعری کی زندگی میں ادیبانہ پن کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہو ہی جاتا ہے لیکن وہ اس کا احساس بھی رکھتے تھے اور اس سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

بمبئی میں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے ہال میں مشاعرہ تھا اور ہم اونچی کلاسوں کے طالب علم بھی جو کچھ ادبی ذوق رکھتے تھے اس میں شریک ہو گئے تھے۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اس دور کے نوجوان ماہر القادری کا اس مشاعرہ میں آئے تھے میں نے پہلی بار ان کو وہاں دیکھا۔ ان کے اشعار میں بڑی روانی اور ان کے ترنم میں بڑا سوز تھا۔ اس وقت وہ رومانی، اخلاقی، اسلامی اور روایتی مخلوط شاعری کے اسپ تازی کے شہسوار تھے ان کے افسانے بھی بعض رسائل میں نظر سے گزرتے تھے۔ بیشتر رومانی پرچوں میں ان کی غزلیں آتی تھیں۔ بعض رسائل مستقل طور پر ان کی منظومات شائع کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ہمارے طالب علمانہ ذہن انھیں ایک مشہور و معروف شاعر اور آفاقی مخلوق سمجھتے تھے۔

پھر کچھ دنوں ان کے معرکے ترقی پسند اشتراکی ادبی تحریک کے ساتھ رہے۔ جدید معریٰ آزاد شاعری سے وہ بہت چڑتے تھے بلکہ اس شاعری کی باقاعدہ پیروڈی کی تھی جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں سنایا کرتے اور

ہنسا ہنسا کر رلایا کرتے تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے شدید مخالف تھے اور جانتے تھے کہ اس تحریک نے اردو زبان و ادب کو تباہ اور اس کی اسلامی روایت کو بری طرح مجروح کیا ہے چنانچہ وہ اسے ادبی تحریک تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سیاسی اشتراکی تحریک کا ادبی بہروپ تھا جو نہ اخلاقی حدود کو

پھر کچھ دنوں ان کے معرکے ترقی پسند اشتراکی ادبی تحریک کے ساتھ رہے۔ جدید معریٰ آزاد شاعری سے وہ بہت چڑتے تھے۔

توڑتی، بھونڈی روایت، دین و اخلاق کو مجروح کرتے ہوئے مناظر، خدا اور رسولؐ کا مذاق اڑاتے ہوئے گھٹیا اشعار اور مسلمانوں کو نامسلمان بنانے کی مسلسل مساعی کوئی ادبی کام تو نہیں تھا۔ یہ تو اشتراکی تحریک ہی کو ادبی پیرایہ میں پیش کرنے کا ڈھنگ تھا۔ اس بنا پر ان کی رائے یہ تھی کہ اشتراکی ادیبوں اور شاعروں نے ہماری ادبی اور اسلامی روایت دونوں سے انحراف کر کے ہمارے نوجوانوں میں غیر ملی اور غیر ملکی اثرات داخل کئے ہیں جو ان کا ناقابلِ معافی جرم ہے۔

ماہر القادری تدریجاً اخلاق و ایمان کے دائرے میں یکسو ہوتے چلے گئے تھے۔ ان کے ادبی اور شعری ذخیرہ کا بہت بڑا حصہ اسلام کی خدمت اور پرورشِ اخلاق کے ضمن میں آتا ہے۔ خصوصاً تقسیمِ ملک کے بعد تو ان کا قلم ایک ساعت کے لئے بھی کسی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل عالم نہ ہونے کے باوجود اپنے حلقۂ احباب میں مولانا کہے جانے لگے۔ ترقی پسند ادیبوں نے تو انھیں اسلامی مولانا کہنا شروع کر دیا تھا کہ بتایا جائے کہ ان کا شعر و ادب سے کیا تعلق ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی اسلامی خدمات نے انھیں اعلیٰ پایہ کے ادیب و شاعر کے ساتھ ایک عالم و فاضل انسان بھی ثابت کر دیا تھا۔

وہ توحید کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ دعا اور استمداد کے بارے میں بے لاگ اور موحد تھے۔ "فاران" کا توحید نمبر انہی کے تصورِ توحید کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ان کی زندگی توکل اور توحید کا اچھا نمونہ تھی۔ اونچے درباروں سے وہ اجتناب کرتے تھے اور جہاں کہیں کسی نفس میں وہ ذوقِ خدائی پاتے تھے اس کے سامنے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ محبتِ رسولؐ میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ عشقِ رسولؐ سے ان کا دل معمور تھا۔ ذکرِ رسولؐ آیا اور ان کی آنکھوں کے کٹورے لبریز ہو گئے۔ بہتر ہے کہ عشق نے اپنی آنکھوں سے دیکھا

نعتوں کا ایک ضخیم مجموعہ ان کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ "در یتیم" کے نام سے۔ انھوں نے ایک ناول نما سیرت کی کتاب بھی لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ "کاروان حجاز" ان کا حج کا سفرنامہ، دل گدازی کا مرقع ہے۔ وہ جب اپنی نعت کا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

اے نام محمدؐ! صلِّ علیٰ — ماہر کے لئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا — آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

تو واقعی ہمیشہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ [illegible] کے رمضان میں جب میں مسجد نبوی میں معتکف تھا تو برطانیہ سے بہت سے مشاعروں میں شریک ہوکر وہ مدینہ میں وارد ہوئے۔ ایک شام دیکھا کہ وہ میرے گوشۂ اعتکاف کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ پھر وہ ملے جس تپاک سے ہمیشہ ملا کرتے تھے اور میرے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئے پھر گھنٹوں بیٹھے رہے۔ کبھی اٹھ کر چلے جاتے۔ مسجد کے مختلف گوشوں کا چکر لگاتے اور پھر آکر بیٹھ

ماہر القادری تدریجاً اخلاق و ایمان کے دائرے میں یکسو ہوتے چلے گئے تھے۔ ان کے ادبی اور شعری ذخیرہ کا بہت بڑا حصہ اسلام کی خدمت اور پرورش اخلاق کے ضمن میں آتا ہے خصوصاً تقسیم ملک کے بعد تو ان کا قلم ایسے روز کے سے لگتے کسی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوا۔

جاتے۔ ماہ رمضان کا کسی رباط میں پڑا تھا لیکن ان کا ڈیرا میرے ہی پاس تھا۔ ان ایام میں انھوں نے اتنی نعتیں سنائیں کہ عشق رسول ﷺ میں جو غفلت بھی کہیں موجود تھی انھوں نے اسے دور کر دیا۔ اپنی بیشتر نعتیں انھیں زبانی یاد تھیں یکے بعد دیگرے سناتے چلے جاتے تھے۔ رمضان کا مہینہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد، روضۂ رسول ﷺ کی قربت اور ماہر صاحب کی پرسوز آواز میں عشق و فریفتگی کے نعتیہ اشعار، ایسا سماں تھا کہ کبھی فراموش نہ ہوگا۔ پورا عشرہ اسی طرح گزرا۔ وہ قانوناً اعتکاف میں نہ تھے لیکن عملاً ان کا بیشتر عشرہ معتکف لوگوں کے ساتھ ہی گزرا۔ پھر عید کے دن وہ جدہ چلے گئے۔

شعر و ادب ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ نہ شعر کہنا ان کے لئے مشکل کام تھا اور نہ نثر لکھنا ان کیلئے دشوار

وہ روزمرہ کے طور پر ان دونوں اقسام ادب کا استعمال کرتے تھے۔ ان کی زبان بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ جگہ جگہ محاورہ، اسلوب انداز، شستہ زبان کی ہر غلطی پر کھٹک جاتے تھے اور اپنے ہر ایک لفظ کے لئے مضبوط دلیل رکھتے اور اس پر پہرہ دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ کبھی کبھی مولانا مودودیؒ جیسے اہل زبان ادیب کے بعض الفاظ و تراکیب پر بھی محاورہ،

غرض ان کا زبان و ادب کا ذوق بہت بلند اور اچھوتا تھا، اور اس میں وہ بڑے بڑے استادانِ فن کی غلطیاں بھی نکال کر دکھا دیا کرتے تھے

گرامر اور روزمرہ کے نقطۂ نظر سے اعتراض کر ڈالتے تھے۔ مدینہ کے قیام کے دوران دو تین جملوں کے بارے میں مجھے بار بار کہتے تھے کہ میں مولانا کو لکھ چکا ہوں، وہ میری بات نہیں مانتے اس لئے تم لکھو، وہ تمہاری بات مان لیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میری سمجھ میں اتنی باریک نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کی اور ان کی دونوں ہی کی عبارت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اتنا باریک تو اہل زبان ہی پہچان سکتے ہیں۔ تو وہ کہنے لگے "نہیں، تم مولانا کو لکھنے سے گریز کا بہانہ بنا رہے ہو تم لکھ کر تو دیکھو، مولانا تمہاری بات مان لیں گے میری بات پر وہ غور نہیں کرتے۔ غرض ان کا زبان و ادب کا ذوق بہت بلند اور اچھوتا تھا اور اس میں وہ بڑے بڑے استادانِ فن کی غلطیاں بھی نکال کر دکھا دیا کرتے تھے۔

وہ نظام اسلامی کی برہنہ شمشیر اور نظام باطل کے سخت دشمن و معاند تھے۔ "فاران" کے تیس سال کے ادارئیے اگر جمع کئے جائیں تو ان کی حق گوئی کی داستان تاریخ کی طرح مرتب ہو جائے گی۔ وہ چاہے لیاقت علی خاں کا دور ہو جو آغاز روایات پاکستان کا دور تھا یا غلام محمد کا آمرانہ عہد ہو، خواہ ایوب خاں کا جابرانہ دور ہو یا بھٹو کی شخصی فسطائیت کا، ماہر صاحب کی زبان حق گوئی پر، اور ان کا قلم حق نگاری کی روایت پر پوری عزیمت کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی کام چھپا کر نہیں کیا اور کسی حق گوئی کے لئے کبھی معذرت نہیں کی۔ انھوں نے پاکستان کے تقاضوں کو اس وقت بھی بیان کیا جب پاکستان کی سرشت ہی کو بدلنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ جبر و تشدد کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے البتہ حق نصیحت: خوش اسلوبی اور قول سدید کے ذریعہ ادا کرتے تھے۔ وہ اسلام کے خلاف ہر کاروائی کے بے لاگ نقاد اور اسلام کے حق میں

ہر کار روائی کے مداح تھے۔ وہ نظام مصطفیٰ کے علمبردار اور داعی تھے اور دنیا سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوئے کہ دشمنانِ اسلام بھی، اسلام کا نام لینا اپنی زندگی کی ضمانت کے لئے ضروری سمجھنے لگے تھے۔

ماہر صاحب حلقۂ ادبِ اسلامی پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔ انھوں نے پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی ملک میں شعر و ادب کے لئے ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کرنا ضروری سمجھا جس پر اسلام کو نظریے کے طور پر، پاکستان کی حمایت اور حب اخلاق کو بنیاد کے طور پر اور مسلم جمہوری معاشرہ کو حقیقتِ مطلوبہ کے طور پر قبول کر کے کام کیا جائے۔ اس حلقہ کی کراچی شاخ کے اجلاسوں میں جب تک وہ حلقہ قائم رہا ماہر صاحب انتہائی باقاعدگی کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے۔ جب کبھی آنے سے معذور ہوتے تو اپنی معذرت بھجوانا ضروری سمجھتے۔ اس حلقے کے قیام اور پرورش میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ برسوں تک یہ سلسلہ قائم رہا اور ماہر صاحب اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس حلقے کی سرگرمیاں برسوں جاری رہیں یہاں تک کہ فتنہ پرور جابرانہ سیاست کے سمندر میں بالآخر سب کچھ غرق ہو کر رہ گیا۔

ماہر صاحب معصوم سے آدمی تھے۔ بات چیت میں اپنے جیسے کی کیفیت، وقفہ وقفہ کے بعد ان کے چہرہ پر طاری ہو جایا کرتی۔ ہر تیکھی بات ان کے لئے خبر ہوتی اور ہر خبر ان کے لئے سنسنی خیزی کا عنصر اپنے اندر ضرور رکھتی۔ کبھی

> ماہر صاحب حلقۂ ادبِ اسلامی پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔
> انھوں نے پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی ملک میں شعر
> و ادب کے لئے ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کرنا ضروری سمجھا

کبھی اپنی اس حیرت میں گم ہو کر وہ کہہ اٹھتے: کیا واقعی بھائی!! کیا واقعی ایسی ہی بات ہے؟ ان کی اس معصومیت سے احباب بہت لطف اندوز ہوتے۔ وہ بڑے معصوم آدمی تھے۔

پکنک میں جانے کا انھیں بہت شوق تھا ہمارے ساتھ متعدد بار پکنک پر گئے۔ پکنک کی سب سے اہم چیز شعر گوئی اور کھانے پینے کی اشیاء کا انتخاب ہوتا تھا۔ انھیں ان دونوں چیزوں سے دلچسپی تھی کھانے پینے کا ذوق بہت بلند تھا۔ تنوع کو بہت پسند کرتے تھے۔ اشیاء کے خاص ہونے پر بہت زور دیتے

تھے۔ پھلوں سے انھیں بہت رغبت تھی۔ مٹھائی بھی شوق سے کھاتے تھے اور اپنے احباب کے درمیان ان کا رویہ بہت بے تکلف اور بے لاگ تھا۔ شعر اور غذا کے معاملے میں ان کی نفاست مسلّم تھی۔ لباس عمر بھر سادہ رہا۔ گرمیوں میں پاجامہ کرتہ اور سردیوں میں شیروانی کا اضافہ اور ٹوپی۔ ایک طویل عرصہ حیدرآباد دکن میں قیام کیا تھا اس لئے حیدرآبادی سوسائٹی کا رکھ رکھاؤ بھی ان میں نمایاں جھلکتا تھا۔ پھر وہ ایک عرصہ بمبئی میں بھی رہے تھے لہٰذا بمبئی کی سوسائٹی کی سادگی اور لبرلزم بھی ان کے ذوق میں نمایاں تھے۔

وہ اکثر سیاسی اور دینی مسائل میں مولانا مودودیؒ سے استفادہ کرتے تھے۔ نیز ان کی معاشرتی اور عملی اصلاح کے نقوش کے دلدادہ تھے۔ مولانا مودودیؒ کی اٹھائی ہوئی تحریکِ اسلامی کے وہ بہی خواہ اور قدر داں تھے اور اس کے لئے عام کارکنوں کی طرح کام کرنا بھی اپنے لئے باعثِ نجات سمجھتے تھے۔

ماہر القادری کی خوبیاں ان گنت تھیں خامیاں خال خال تھیں۔ انھوں نے دنیا کو اپنے وجود سے بہار بنایا۔ اسے اپنے انفاس کی خوشبو سے معطر کیا۔ اسے اپنے اشعار کی بہار سے پُر رونق کیا۔ اس میں عمر بھر اصلاح و تبلیغ اور حسن و رعنائی کا کام کرتے رہے۔ انھوں نے انہی چیزوں سے سب سے زیادہ محبت کی جن کی محبت انسان کے لئے لازم ہے۔ وہ اللہ کے سچے بندے، رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے عاشق اُمتی، مسلمان قوم کے درد مند فرد اور نوعِ انسان کے قابلِ فخر فرزند تھے۔ ان کے چلے جانے سے دنیا کے انواع و اقسام میں بظاہر کوئی کمی نہیں ہے لیکن حسن و لطافت تو وہ ہے جو چمن میں ایک گلاب کا پھول مرجھا کر کمی پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی ہی خوشبو دار کمی ماہر صاحب کے رخصت ہونے سے چمنستانِ دنیا سے واقع ہو گئی ہے۔ چمنستانِ دنیا کا بلبلِ ہزار داستان جو ہمارے سامنے سے رخصت ہو گیا ہے تو یہ چمن سونا سونا محسوس ہوتا ہے۔

بقیہ حضرت ام سلمہؓ

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کر لیا اور ان کی وہ دعا بجسم قبولیت بن کر سامنے آ گئی جو انھوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے وقت کی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ابو سلمہؓ کا نعم البدل عطا فرما دیا اور اس وقت سے حضرت ام سلمہؓ صرف سلمہ کی ماں نہیں رہ گئیں بلکہ تمام مسلمانوں کی ماں ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت ام سلمہ کے چہرے کو جنت میں تر و تازہ اور بارونق رکھے، ان سے راضی رہے اور ان کو راضی رکھے۔ آمین

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا
ترجمانی: ابو جاوید

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہؓ غیر معمولی شرف فضیلت کی حامل خاتون تھیں۔ ان کے والد کا شمار قبیلہ بنی مخزوم کے مشہور اور اہم سرداروں اور عرب کے معدودے چند اصحاب جود و سخا میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی سخاوت و فیاضی کی وجہ سے "زاد الراکب" کے لقب سے معروف تھے، کیوں کہ ان کے علاقے کا قصد کرنے والے قافلے اور ان کی معیت میں سفر کرنے والے مسافر کبھی اپنے ساتھ زادِ راہ لے کر چلنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ ان کے شوہر عبداللہ بن عبدالاسد تھے۔ وہ ان دس مسلمانوں میں سے تھے جو بالکل آغاز دعوت کے زمانے میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان سے پہلے صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان چند لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جن کی تعداد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بھی کم تھی۔ ان کا نام ہند بنت ابی امیہ تھا، لیکن ان کی کنیت "ام سلمہ" ان کے نام سے زیادہ مشہور تھی۔

وہ اپنے شوہر حضرت ابو سلمہؓ کے ساتھ ہی اسلام لائیں۔ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والی دوسری خاتون تھیں۔ یہ شرف ان سے پہلے صرف حضرت خدیجہؓ کو حاصل ہوا تھا۔ جیسے ہی ان کے اور ان کے شوہر کے مسلمان ہونے کی خبر قریش کو ملی، وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے، ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو گیا اور انہوں نے ان دونوں کو ایسی اذیت ناک اور عبرت انگیز سزائیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جو مضبوط چٹانوں کو ہلا دینے کے لئے کافی تھیں، لیکن انہوں نے ان سزاؤں کے سامنے نہ تو کسی ضعف و کمزوری کا اظہار کیا، نہ ہمت ہاری، نہ کسی قسم کے تردد و تذبذب میں مبتلا ہوئے۔

جب اذیت رسانی کا سلسلہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی، تو یہ دونوں ہجرت کرنے والے "قافلۂ مہاجرین" میں پیش پیش تھے۔ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر اجنبی دیار اور انجانے

علاقے کی طرف چل پڑے، اور اپنے پیچھے مکہ میں اپنا عالی شان مکان، اپنا بلند مقام اور اپنی خاندانی شرافت چھوڑ گئے۔ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کے خواہاں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالب تھے۔

اگرچہ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر کو نجاشی (شاہ حبشہ) کی حمایت و سرپرستی میں نہایت سکون و اطمینان کی زندگی نصیب ہوئی تھی مگر اس کے باوجود مہبط وحی (مکہ) واپس جانے اور سرچشمہ ہدایت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیدار کی آرزو ان کے دلوں کو ہر وقت مضطرب اور بے چین رکھتی تھی، اور پھر جب سرزمین حبشہ میں مقیم مہاجرین کے پاس مسلسل اس طرح کی خبریں آنے لگیں کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے، حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن خطاب کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی طاقت کافی بڑھ گئی ہے اور قریش کی اذیت رسانیوں اور ان کے ظلم و ستم کا زور بڑی حد تک ٹوٹ چکا ہے، تو ان میں سے کچھ لوگوں نے مکہ واپس لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ دیار حرم میں پہنچنے کا شوق اور بارگاہ رسالت میں حاضری کا اشتیاق انہیں کھینچے لئے جا رہا تھا چنانچہ واپسی کے اس سفر میں بھی حضرت ام سلمہ اور ان کے شوہر سب سے آگے آگے تھے، لیکن واپس آنے والوں پر بہت جلد یہ بات منکشف ہو گئی کہ ان کے پاس اس سلسلے میں جو خبریں پہنچی تھیں، ان میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا، اور مسلمانوں نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد جو تھوڑی سی پیش قدمی کی تھی، قریش کی طرف سے اس کی شدید مزاحمت ہوئی ہے۔

اس کے بعد مشرکین نے مسلمانوں کو ستانے اور ان کو خوف زدہ کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے اور ان کے ظلم و ستم کی چکی پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چلنے لگی، اس لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرما دی، اور حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر نے قریش کی اذیتوں سے نجات حاصل کرنے اور اپنے دین کی حفاظت کے خیال سے جلد از جلد ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا مگر یہ کام ان کے لئے اتنا آسان نہ تھا جتنا وہ گمان کرتے تھے، اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے

سکے۔ ان کو ایسے سخت اور المناک حالات سے گذرنا پڑا جن کے سامنے تمام سختیاں ہیچ نظر آتی ہیں۔ ہم ہجرت کی یہ المناک داستان خود حضرت ام سلمہؓ کی زبانی بیان کرتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا ان کی تصویر کشی زیادہ مکمل ہے بیان کرتی ہیں کہ۔

"جب ابو سلمہؓ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی ٹھانی تو انہوں نے میرے لیے سواری کا اونٹ تیار کیا۔ مجھے اس پر سوار کیا اور میرے بچے سلمہ کو میری گود میں ڈالا اور کسی چیز کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اونٹ کی نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم مکہ سے باہر نکلتے، میرے قبیلہ (بنی مخزوم) کے کچھ لوگوں نے ہم جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، اور ابو سلمہ سے کہنے لگے کہ تم اپنے متعلق جو چاہو فیصلہ کرو مگر تمہاری بیوی سے تمہیں کیا سروکار؟ یہ ہماری بیٹی ہے، ہم تم کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ اس کو اپنے ساتھ لئے ہوئے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرو۔" پھر وہ ان کے اوپر جھپٹ پڑے اور مجھے زبردستی ان سے چھین کر الگ کر دیا۔ جب میرے شوہر ابو سلمہ کے قبیلے (بنو عبدالاسد) کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ میرے قبیلہ والوں نے مجھے اور میرے بچے کو ابو سلمہ سے چھین لیا ہے تو وہ نہایت غضبناک ہوئے اور کہنے لگے کہ "خدا کی قسم جب تم نے اپنے خاندان کی لڑکی کو ہمارے قبیلہ کے آدمی سے چھین لیا تو ہم بھی بچے کو اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ وہ ہمارے خاندان کا بچہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں۔" پھر میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ میرے بچے سلمہ کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ بھی اکھڑ گیا اور وہ اس کو چھین کر لے گئے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے اور میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ ایک طرف میرے شوہر اپنے دین اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے مدینہ چلے گئے۔ دوسری طرف میرے بچے کو بنو عبدالاسد نے جبراً مجھ سے چھین لیا اور میرے قبیلہ بنو مخزوم نے زبردستی مجھے اپنے پاس روک لیا۔ اس طرح ذرا سی دیر میں مجھے، میرے شوہر اور میرے بچے کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔"

پھر حضرت ام سلمہؓ اپنی داستان کا اگلا حصہ بیان کرتی ہیں۔

"اس کے بعد سے میرا روزمرہ کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح سویرے مکہ کے باہر ابطح کی طرف نکل جاتی اور اس جگہ جا کر بیٹھ جاتی جہاں میرے ساتھ یہ المیہ پیش آیا تھا، میں ان بیتی ہوئی گھڑیوں

کو یاد کرتی رہتی جب میرے شوہر اور بچے کے درمیان جدائی کی دیوار حائل کر دی گئی تھی۔ میں برابر روتی رہتی یہاں تک کہ رات کے سائے گہرے ہو جاتے۔ میری یہ حالت ایک سال یا اس کے لگ بھگ رہی۔ آخر کار میرے بنی عم میں سے ایک شخص کا گذر میری طرف سے ہوا۔ اس کو میرے اس حال پر ترس آیا اور اس نے میرے قبیلہ والوں سے کہا کہ تم لوگ اس غریب کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اسکو اس کے شوہر اور بچے سے جدا کر کے اس کے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ برابر ان کو میرے حق میں ہموار کرتا رہا اور ان کے جذبۂ ترحم کو مہمیز کرتا رہا حتیٰ کہ وہ اس حد تک نرم ہو گئے کہ انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن میرے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں اپنے لخت جگر کو مکہ میں بنی عبدالاسد کے یہاں چھوڑ کر خود اپنے شوہر کے پاس مدینہ چلی جاتی اور ایسی صورت میں جب کہ میں خود دار الہجرت (مدینہ) پہنچوں اور میرا کمسن بچہ مکہ میں اس حال میں پڑا ہو کہ اس کے متعلق مجھے کوئی خبر نہ ملے۔ کیسے ممکن تھا کہ میری مامتا کی آگ ٹھنڈی ہو اور میری آنکھوں سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب تھم سکے۔ بعض لوگوں نے جب مجھ کو اضطراب رنج و غم جھیلتے اور کرب دوام سے نبرد آزما ہوتے دیکھا تو ان کو میری حالت پر رحم آیا اور انہوں نے بنی عبدالاسد سے بات کر کے ان کو میرے ساتھ نرم رویہ اپنانے پر آمادہ کر لیا چنانچہ انہوں نے میرے بچے سلمہ کو مجھے واپس دے دیا۔"

"جب میں نے مکہ میں ٹھہر کر مدینہ جانے والے کسی ہم سفر کے انتظار میں وقت گنوانا اور اپنی روانگی کو مزید موخر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس اثنا میں کہیں کوئی ایسا حادثہ نہ پیش آ جائے جو مجھے میرے شوہر کے پاس پہنچنے سے روک دے۔ اسلئے میں نے جلدی سے اپنی سواری کے اونٹ کو تیار کیا۔ بچے کو گود میں لیا اور اپنے شوہر سے ملنے کیلئے مدینہ کی طرف چل پڑی جب میں تنعیم کے مقام پر پہنچی تو میری ملاقات عثمانؓ بن طلحہ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "زاد الراکب" کی بیٹی! کہاں جا رہی ہو؟"

ع۱ عثمان بن طلحہ زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ فتح مکہ میں شریک ہوئے۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بیت اللہ کی کنجی ان کے حوالے کی۔

"اپنے شوہر کے پاس مدینہ جا رہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ خدا تعالیٰ اور میرے اس بچے کے سوا میرے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔

"خدا کی قسم، جب تک تم مدینہ نہ پہنچ جاؤ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرے اونٹ کی نکیل تھام لی اور مجھے ساتھ لیکر روانہ ہو گئے۔ خدا کی قسم، اس سے پہلے مجھے کسی ایسے عرب کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی جو ان سے زیادہ کریم النفس اور شریف ہو۔ ان کا حال یہ تھا جب وہ کسی منزل پر پہنچتے تو وہ اونٹ کو بٹھاتے اور خود مجھ سے پرے ہٹ جاتے۔ جب میں اونٹ سے نیچے اتر کر زمین پر ٹھیک سے کھڑی ہو جاتی تو وہ اونٹ کے پاس آتے، کجاوہ اتار کر زمین پر رکھ دیتے اور اونٹ کو لے جا کر کسی درخت سے باندھ دیتے۔ پھر مجھ سے دور کسی سائے میں لیٹ جاتے۔ جب روانگی کا وقت ہو جاتا تو وہ اٹھ کر اونٹ کے پاس آتے اسکو تیار کر کے میرے قریب لاتے اور مجھے اس پر سوار ہونے کی اجازت دیتے ہوئے دور ہٹ جاتے۔ جب میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ جاتی تو آتے اور اسکی نکیل پکڑ کر آگے آگے چل پڑتے۔ مدینہ پہنچنے تک راستہ بھر میرے ساتھ ان کا یہی رویہ رہا۔ جب ان کی نظر بنی عوف بن عمرو کی بستی قبا پر پڑی تو بولے کہ "تمہارے شوہر اسی بستی میں ہیں، خدا کا نام لیکر چلی جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لئے مکہ کی طرف مڑ گئے۔"

بچھڑے ہوئے ایک طویل عرصے کی جدائی کے بعد دوبارہ ایک دوسرے سے ملے۔

حضرت ام سلمہؓ کی آنکھیں اپنے شوہر کے دیدار سے ٹھنڈی ہوئیں۔ اور حضرت ابو سلمہؓ کے دل کو اپنے بیوی اور بچے کو پا کر قرار و سکون نصیب ہوا۔ اس کے بعد واقعات اور حوادث تیزی سے گزرتے رہے۔ یہ غزوۂ بدر ہے جس میں حضرت ابو سلمہؓ شریک ہوئے اور فتح یاب و ظفر مند ہو کر مسلمانوں کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور یہ ہے معرکۂ احد، جنگ کے بعد حضرت ابو سلمہؓ اس غزوہ میں بھی ایک بہادر کی طرح شریک ہوئے۔ اور اس میں اپنی جرأت و شجاعت کے انمٹ نقوش چھوڑ آئے۔ جنگ سے واپس آئے تو ان کا جسم

زخموں سے چور تھا۔ وہ برابر زخموں کا علاج کرتے رہے اور بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم مندمل ہو چکے ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ زخم بظاہر تو ابھر گئے تھے مگر اندر ہی اندر خراب ہو گئے تھے۔ ایک دن اچانک پھٹ گئے اور حضرت ابو سلمہؓ بستر سے لگ گئے۔ اسی زمانے میں جب وہ اپنے زخموں کے ساتھ کشمکش میں مصروف تھے ـــــ ایک دن اپنی بیوی سے بولے کہ ام سلمہؓ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔

لَا يُصِيبُ أَحَدًا مُصِيبَةٌ فَيَسْتَرْجِعُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَيَقُولُ اللّٰهُمَّ عِنْدَكَ أَحْتَسِبُ مُصِيبَتِي هٰذِهِ، اللّٰهُمَّ اخْلُفْنِي خَيْرًا مِنْهَا، إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ۔"	"جو شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے اور دعا کرے کہ خدایا! میں تجھ سے ہی اس مصیبت کا اجر چاہتا ہوں، الٰہی تو مجھے اس کا بہترین نعم البدل عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ دعا کرنے کے لئے تلافی مافات کی بہترین صورت پیدا کر دیتا ہے۔"

حضرت ابو سلمہؓ کئی روز تک بستر علالت پر پڑے رہے۔ اسی دوران ایک دن صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ آپ دروازے میں داخل ہوئے اور ابھی اچھی طرح ان کو دیکھ بھی نہیں سکے تھے کہ انہوں نے زندگی کو خیرباد کہہ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کی آنکھوں کو بند کیا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے ہوئے انکے لئے دعا کی۔

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمُقَرَّبِينَ وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ فِي الْغَابِرِينَ وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ وَنَوِّرْ لَهُ فِيهِ	اے اللہ! ابو سلمہ کی مغفرت فرما دے، مقربین میں ان کو بلند مرتبہ عطا کر اور ان کے پسماندگان میں ان کا قائم مقام ہو جا۔ رب العالمین! ہماری اور ان کی مغفرت فرما، ان کی قبر کو کشادہ اور منور کر۔

ادھر جب حضرت ام سلمہؓ کو وہ دعا یاد آئی جو حضرت ابو سلمہؓ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بتائی تھی تو انہوں نے کہا۔

اللّٰھم عندک احتسب مصیبتی ھذہ ...... لیکن ان کا دل اللّٰھم اخلفنی خیراً منھا کہنے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں کہ ابو سلمہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو نعم البدل کے طور پر طلب کیا جائے ...... لیکن کچھ دیر کے بعد انہوں نے دعا مکمل کر دی۔

حضرت ام سلمہؓ کی اس مصیبت پر مسلمانوں نے غیر معمولی صدمہ و افسوس کا اظہار کیا انہیں "ایم العرب" کے لقب سے نوازا کیونکہ مدینہ میں ان کے ننھے ننھے بچوں کے سوا ان کے اہل قبیلہ و خاندان میں سے کوئی ان کا قریبی سرپرست اور ہمدرد نہ تھا۔

مہاجرین و انصار دونوں نے بیک وقت اپنے اوپر حضرت ام سلمہ کے حق کو محسوس کیا اور ان کی عدت وفات گزرتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا مگر انہوں نے ان کا پیغام منظور نہیں کیا پھر حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے ساتھ نکاح کی پیشکش کی مگر انہوں نے حضرت عمرؓ کے پیغام کو بھی اسی طرح رد کر دیا جس طرح وہ حضرت ابوبکرؓ کے پیغام کو نامنظور کر چکی تھیں۔ پھر جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے پیغام دیا تو حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے اندر تین ایسی خصلتیں ہیں جو شاید آپ کو پسند نہ آئیں پہلی بات یہ ہے کہ میں انتہائی غیرت مند اور خوددار عورت ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری کوئی بات آپ کی طبع مبارک کو ناگوار گزر جائے گی اور آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے سزا دے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک سن رسیدہ عورت ہوں اور تیسری یہ کہ میں بال بچوں والی عورت ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سن کر ارشاد فرمایا کہ۔

یہ جو تم نے اپنی غیرت مندی اور خودداری کی بات کہی ہے تو میں اس کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہارے اندر سے اس کو دور کر دے اور جہاں تک سن رسیدگی کی بات ہے تو اس میں میری حالت تم سے مختلف نہیں ہے۔ اور یہ جو تم نے بال بچوں کا ذکر کیا ہے تو اس کے لئے کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔"

(بقیہ صفحہ ۷۹ پر)

امجد علی

جرمنی میں ایک انوکھا روحانی تجربہ

یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں پروٹسٹنٹ فرقے کی جانب سے "پرشین سوسائٹی مشن" نامی تبلیغی مشن میں نوجوان مبلغ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ویسے تو اس مشن کا دائرہ کار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن جس شاخ سے میرا تعلق تھا اس کا کام یورپ تک محدود تھا۔ میں نے اس مشن کے ہمراہ مختلف یورپی ممالک کے دورے کئے۔ مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کر کے ہم انہیں عیسائیت کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتے۔ ہمیں یہ ہدایت تھی کہ جو مبلغ کسی شخص تک عیسائیت کا پیغام پہنچائے بعد میں وہ اس کے تمام تر دینی امور کا ذمہ دار ہو گا۔ یوں مبلغ ہاتھ دھو کر اس شخص کے پیچھے پڑ رہتا حتیٰ کہ وہ شخص ایمان لے آتا۔ مجھے یہ طریقہ پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی میں دین کے احکامات اور تعلیمات کا دوسرے لوگوں کو درس دیتا تھا خود ان کا قائل نہ تھا۔ یہ سلسلہ دو سال تک چلا اس کے بعد میں جرمنی واپس آ کر پھر چرچ سے منسلک ہو گیا۔

اس دوران میں نوجوان عیسائیوں کی مختلف مذہبی تنظیموں کا رکن رہا لیکن میرا دل مطمئن نہ تھا اور روح بے چین رہتی تھی۔

۱۹۵۶ء سے جرمنی میں مختلف ممالک کے سیاسی پناہ گزینوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ سیاسی پناہ کے متلاشیوں میں بہت سے عرب نوجوان خصوصاً اردنی مسلمان تھے۔ میرا ان لوگوں سے میل جول بڑھا تو انہوں نے اپنی محبت اور خوش اخلاقی سے میرا دل موہ لیا۔ یہ نوجوان مجھے وقتاً فوقتاً اپنے گھروں پر مدعو کرتے۔ ان کی اور بہت سی چیزوں کے علاوہ مجھے ان کی عربی "موسیقی" بے حد پسند آئی۔ یہ موسیقی مجھے اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوتی۔ میں نے اس کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ موسیقی نہیں بلکہ ہماری مقدس کتاب قرآن مجید کی تلاوت ہے۔

میں ایک عرصے سے عیسائی مبلغ بنا ہوا تھا مگر یہ پہلا دن تھا کہ میں نے قرآن کا نام سنا۔ تلاوت سن کر قرآن مجید سے ایک روحانی تعلق تو قائم ہو ہی گیا تھا مگر اب فیصلہ کیا کہ اس مقدس کتاب کو پڑھوں گا۔ ایک لائبریری سے میں جرمن ترجمہ قرآن لے آیا۔ جیسے جیسے اسے پڑھتا گیا میرا دل کہتا گیا کہ یہی سچا مذہب

ہے جس کی مجھے ہمیشہ سے ضرورت اور تلاش تھی۔ اس کا ہر قریب، ہر نکتہ دلیل اور عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا۔
اس دین کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے مجھے
کسی اسلامی ملک کا جائزہ لینا چاہیے۔ نظر انتخاب اردن ہی پر پڑی۔ وہاں میں پہلی بار ۱۹۷۷ء میں گیا۔ ۱۹۷۸ء
میں پھر دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ مسلمان ہو جاؤں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں جب
اردن گیا تو وہاں اسلامی عدالت میں جا کر اسلام قبول کر لیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ میں اسلام کی طرف لوٹ آیا۔ اس
لیے کہ اب میرا ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب دین اسلام ہی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ویسے
بھی ہر بچہ فطرت مسلم ہی پر پیدا ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں جرمنی واپس آیا تو مجھے اپنا پورا وجود بدلا ہوا
نظر آ رہا تھا اور میں نئی تبدیلی اپنے وجود میں شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے روح پر سے کوئی
بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

قبول اسلام کی یہ ایمان افروز داستان مغربی برلن میں مقیم نو مسلم جرمن ہارٹ موٹ محمد ہیر سوگ
کی ہے۔ وہ فروئنڈے ڈیس اسلام یعنی محبان اسلام کے بانی چیئرمین ہیں۔ یہ تنظیم گزشتہ چھ سات سال سے
جرمنی اور خصوصاً مغربی برلن میں دین اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل
ہے۔

نومبر ۱۹۷۹ء میں جب محمد ہیر سوگ واپس برلن پہنچے اور جب ان کے دوست احباب کو ان کے قبول اسلام
کی خبر ہوئی تو وہ حیران ہوئے کیونکہ ان کے خیال میں ہیر سوگ ایک کٹر عیسائی تھے۔ ہیر سوگ کے مذہب
کے بارے میں ان لوگوں کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔ کبھی ان سے پوچھتے کہ اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیمات کیا ہیں؟
ابتدا میں تو وہ خود اس کی وضاحت کرتے رہے لیکن ایک مرحلے پر محسوس ہوا کہ اتنے لوگوں کو زبانی دین کے
بارے میں بتانا خاصا مشکل ہے۔ انہی دنوں میونخ سے ایک پمفلٹ موصول ہوا جس کا عنوان تھا "اسلام
کیا ہے؟" اس پمفلٹ نے ہیر سوگ کا کام آسان کر دیا۔ اب جو بھی اسلام سے متعلق معلومات چاہتا وہ
اسے یہ پمفلٹ دے دیتے۔

اسی دوران میں ہیر سوگ کی ملاقات اردن کے ایک مسلمان محمد الفواصی سے ہوئی جو کسی جگہ کام کرتا
تھا جہاں وہ کام کرتے تھے۔ دین کے بارے میں ان کی معلومات کا ذخیرہ بے پناہ تھا مگر وہ ارکان اسلام اور
تعلیمات اسلام سے بہت دور تھا۔ ہیر سوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ان کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے

وہ روزانہ قرآن پڑھ کر کام پر جاتے۔ جو چیز سمجھ میں نہ آتی اس کے متعلق محمد الفواصی سے پوچھتے۔ وہ نام کو مسلمان
ہی تھے لیکن قرآن سے متعلق سوالات پر ہیر سوگ کو مطمئن کرنا ان کی ذہنی مجبوری بن گئی۔ اسے خود بھی حوالہ جات کی
خاطر اسلامی لٹریچر اور قرآن سے رجوع کرنا پڑا۔ جوں جوں ڈھونڈتے گئے محمد الفواصی قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں اس طرح
گم ہو گئے کہ ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ چونکہ ہیر سوگ تبلیغی مشن سے منسلک رہا تھا اس لیے انہوں نے سوچا کوئی ایسی صورت
ہونی چاہیے کہ اسلام کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جا سکے۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے محمد الفواصی
کے ساتھ مل کر فروئنڈے ڈیس اسلام کی بنیاد رکھی۔

جرمنی میں اسلام، مسلمانوں اور اسلامی تنظیموں کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ سب سے پہلی جرمن مسلم تنظیم
کا قیام فریڈرک ولیم اول کے دور میں ۱۷۳۰ء میں عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا صدر دفتر پوٹسڈام میں تھا۔ جدید جرمنی
میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کا مرکز برلن منتقل ہو گیا۔ یہاں وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی تنظیمیں وجود میں آئیں۔
۱۹۳۳ء میں جرمن مسلم سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی میں روسی مسلمان
مہاجرین کے نام سے ایک طاقتور اور مضبوط جماعت وجود میں آئی۔ اس کی بنیاد روس سے ہجرت کر کے آنے والے
مسلمانوں نے ڈالی تھی۔ یہ تنظیم آج بھی ایک اہم ادارہ ہے۔ آج کل اس کا صدر دفتر [illegible]
جرمنی میں مسلمانوں کی [illegible] تنظیمیں کام کر رہی ہیں
چلا رہے ہیں۔

"فروئنڈے ڈیس اسلام" مؤتمر عالم اسلامی کی اس جرمن شاخ کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے جو
۱۹۳۲ء میں مغربی برلن میں عمل میں آیا تھا اور جس کا دفتر آج بھی اسی شہر میں ہے۔ یہ تنظیمیں ہفتہ وار اجتماعات منعقد
کرتی ہیں جن میں درس قرآن اور درس حدیث کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ مختلف دینی موضوعات پر سیمینار اور
مذاکرے بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ جرمن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان تنظیموں کی رکن ہے۔ اراکین کے علاوہ بھی
بہت سے غیر مسلم جرمن ان ہفتہ وار اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات اور مذاکرات سے غیر مسلموں
کو اسلام کو جاننے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ "فروئنڈے ڈیس اسلام"
کی کوششوں سے اس سلسلے میں بہت خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں جہاں ہر شخص قرآن پاک اور اسلام کے بارے میں ہر قسم کی
معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن پاک اور راہ ہدایت کے متلاشی افراد کی اکثریت نوجوانوں کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے
یورپ میں نوجوانوں کا یہ طبقہ جس کی روح پر عصر حاضر کی یورپی روایات اور ذہنی رجحانات نے گہرے زخم لگائے ہیں

کثرت سے مذہب کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

جرمن عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے اور نئے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لئے جرمن زبان میں بہت سے جریدے شائع ہوتے ہیں۔ میونخ کا اسلامی مرکز ہر دو ماہ بعد ایک بے حد معیاری پرچہ "اسلام" کے نام سے شائع کرتا ہے۔ ایک اور معیاری رسالہ "الفجر" کے نام سے ہیمبرگ کے اسلامی مرکز کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ یہ دونوں جرمن زبان میں چھپتے ہیں۔ فرونڈشافٹ ڈیس اسلام کی طرف سے "اللہ اکبر" کے نام سے ہر دو ماہ بعد ایک رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں اصلاحی مضامین کے علاوہ پوری مسلم دنیا کی چیدہ چیدہ اور اہم خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ "برلن انچ کول" کے نام سے ایک پمفلٹ ہر دو ماہ بعد شائع کیا جاتا ہے جس میں تنظیم کے آئندہ پروگرام اور سابقہ سرگرمیوں کی تفصیلات شامل ہوتی ہیں۔ اب اس تنظیم کی جانب سے "مسلم ریویو" نامی جریدہ بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے جس کا ڈیکلریشن حال ہی میں واپس خرید لیا گیا ہے۔ پہلے پہل یہ جریدہ جرمن مسلم سوسائٹی کی جانب سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا گیا تھا۔

ہیر ہوگ نے بتایا کہ غیر مسلموں تک پہنچنے کے لئے وہ یہ جریدہ شائع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کچھ اور تدابیر بھی کرتے ہیں۔ مختلف اخبارات اور رسالوں میں تنظیم کی طرف سے اشتہار دیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ یہ اشتہار پڑھ کر دفتر میں آتے یا ٹیلیفون کرتے ہیں۔ ہیر ہوگ مختلف جریدوں میں اسلامی موضوعات پر مضامین بھی تحریر کرتے ہیں۔ ریڈیو پر بہت سے دینی پروگرام بھی نشر کرتے ہیں۔ حال ہی میں وہ ترک کیبل ٹیلیویژن کے ایک مذہبی پروگرام میں بھی شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے تیار کر کے ریڈیو پر ادا کیا۔ ایک پروگرام سن کر مشرقی برلن سے ایک جرمن نے ان سے رابطہ قائم کیا اور اسلام کے موضوع پر کچھ مواد بھیجنے کے لئے کہا۔ ہیر ہوگ نے اسے لٹریچر بھیجا جسے پڑھ کر کچھ عرصہ بعد اس جرمن نے اسلام قبول کر لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برلن شہر دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں مغربی حصے کی چاروں سمت ایک دیوار تعمیر کر دی گئی۔ اب کہنے کو تو یہ ایک ہی شہر کے دو حصے ہیں اور انھیں درمیان سے چند انچ چوڑی دیوار جدا کرتی ہے لیکن دونوں حصے دو مختلف طاقتوں کی ملکیت ہیں اور ان کے نظام ہائے سیاست میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرقی جرمنی میں بھی اسلام کے نام لیوا جرمنوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بستی ہے۔

مغربی جرمنی کے "اسلامک آرکائیو" کا ایک سروے بتاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے جرمنوں کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو پہلے بھی مذہب سے لگاؤ رکھتے تھے اور کچھ تو باقاعدہ چرچ سے وابستہ تھے۔ اسلامی تنظیمو

سے وابستہ یا سیاسی پروگراموں میں دلچسپی رکھنے والے افراد کی ۳۰ فیصد تعداد یونیورسٹی پروفیسرز، دانشور حضرات، اسکولوں کے اساتذہ اور طلبہ کی ہے۔ فرونڈشافٹ ڈیس اسلام کے دو شعبے ہیں۔ ایک کا نام بین الاقوامی حلقۂ احباب ہے۔ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی ممبر بن سکتے ہیں۔ اس شعبے کے قیام کا مقصد عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ بقول ہیر ہوگ "عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد تثلیث کے عقیدے پر یقین نہیں رکھتی بلکہ ایک خدا کی قائل ہے۔ بعض گروہ تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بھی مانتے ہیں۔ ہمارا ان لوگوں سے اپنے اس خصوصی شعبے کے ذریعہ قریبی رابطہ رہتا ہے۔ مذاکرے ہوتے ہیں، بات چیت ہوتی ہے اور یقیناً ان کے مثبت اثرات نمایاں ہو رہے ہیں، اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔ وہ اسلام کے روشن پہلوؤں سے جس طرح متاثر ہوتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ جلد یا بدیر اسلام ہی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں گے۔"

"فرونڈشافٹ ڈیس اسلام" کا دوسرا شعبہ "مذہبی مسلم حلقہ" ہے، جو صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی اور مغربی برلن میں ۱۹ لاکھ مسلمان بستے ہیں جن میں سے ۳ ۔ ۱ لاکھ کے قریب ترک ہیں۔ جرمن مسلمانوں کی تعداد چالیس سے پچاس ہزار تک ہے جن میں اکثریت خواتین کی ہے۔ مغربی برلن میں تقریباً ۱۲۵۰۰۰ مسلمان رہتے ہیں جن کی اکثریت ترکی اور یوگوسلاویہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی بہت سی تنظیمیں مختلف مقامات پر مختلف محاذوں پر کام کر رہی ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام اسلامی تنظیمیں مل جل کر کام کریں کیونکہ جس طرح جرمن حکومت عیسائیوں یا یہودیوں کو باقاعدہ ایک مذہبی گروہ کے طور پر تسلیم کرتی ہے مسلمانوں کو ابھی اس طرح نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہودی تعداد میں کم ہیں مگر ان کے مخصوص اثر و رسوخ کی وجہ سے جرمن حکومت کو ان کی بڑی ناز برداری کرنی پڑتی ہے خصوصاً مغربی برلن میں یہودیوں کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ ان حالات میں اسلامی تنظیمیں متحد ہو کر ہی اپنے مقاصد حاصل کر سکتی ہیں۔

جرمن میں قرآنی تراجم کی کہانی بہت پرانی ہے۔ اس زبان میں قرآن مجید کے بیسیوں تراجم موجود ہیں یکے بعد دیگرے تراجم معیاری اور بہتر ہوتے چلے گئے ہیں۔ مؤتمر عالم اسلامی جرمنی اور فرونڈشافٹ ڈیس اسلام قرآن کے ایک اور ترجمے پر کام کر رہے ہیں۔ اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ تشریح اور تفسیر بھی درج ہوگی۔ اس منصوبے پر بہت سے ماہر دانشور کام کر رہے ہیں جو عربی اور جرمن دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر مکمل ہونے کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جو سارے کام کی جانچ پڑتال کرے گی۔ حتمی

سکے۔ قرآن کے ترجمے کا مسودہ کراچی بھیجا جائے گا اور یوں توقع ہے کہ یہ قرآن بھی اکتوبر ۱۹۸۸ء تک شائع ہو جائے گا۔

حج پہ جانے والے جرمن مسلمانوں کی تعداد میں بھی ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے سال جرمنی سے حج پہ جانے والے افراد کی تعداد کم و بیش ۲۵۰۰ تھی جن میں جرمنوں کے علاوہ دوسری قومیتوں کے افراد بھی شامل تھے۔

ریڈیو مغربی جرمنی کی عالمی سروس ڈوئچے ویلے سے پچھلے سوا سال سے "اسلامی خبریں" نشر ہو رہی ہیں جنہیں جرمن مسلمان محمد سلیم عبداللہ ترتیب دیتے ہیں۔ ان خبروں کو ترجمہ کر کے مختلف زبانوں کی نشریات میں پیش کیا جاتا ہے۔ محمد سلیم عبداللہ جو اسلامک آرکائیو جرمنی کے نگراں ہیں، وہ نہ صرف "تزوینٹرم ڈیس اسلام" کی طرف سے شائع ہونے والے جرائد "اللہ اکبر"، "برلن ایجوکیٹل" اور "مسلم ریویو" کے مدیر ہیں بلکہ ان کی اسلامی موضوعات پر جرمن زبان میں بہت سی تصنیفات بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔

پورے وفاقی جمہوریہ جرمنی اور مغربی برلن میں تقریباً ایک ہزار مساجد موجود ہیں۔ صرف مغربی برلن میں چالیس ایسے مقامات ہیں جہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سی مسجدیں، کارخانوں، گرجے، اسٹوروں اور دوکانوں میں بنائی گئی ہیں لیکن چند باقاعدہ مساجد تعمیر بھی ہوئی ہیں۔ برلن میں سب سے پہلی مسجد ۱۹۲۶ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد ترک مسلمانوں کے تاریخی قبرستان میں واقع ہے۔ ۱۹۲۴ء میں جرمن مسلم سوسائٹی کی جانب سے ولمرز ڈورف مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ آج کل برلن کی تمام اسلامی تنظیمیں حکومت سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ مغربی برلن میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر ایک بڑی جامع مسجد کی منظوری دی جائے۔ حکومت نے ہاں تو کر دی ہے مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی ہے کہ مسجد کی تعمیر کے لئے مناسب جگہ کی تلاش اسلامی تنظیمیں خود کریں گی۔ اسلامی تنظیموں سے یہ مرحلہ سر نہیں ہو سکا اور یوں یہ مسئلہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ایک اہم اطلاع کے مطابق مسجد کی تعمیر پر اندازاً ۴۰ ملین مارک لاگت آئے گی۔

دوسری جرمن اسلامی تنظیموں کی طرح "تزوینٹرم ڈیس اسلام" کا بھی یورپ، شرق اوسط اور ایشیا کی تنظیموں سے رابطہ رہتا ہے۔ جناب ہیر سگر [illegible] حال ہی میں اپنی تنظیم کے دورے [illegible] کے اسلامی مراکز سے [illegible] قائم ہو سکے ہیں۔ ایک غیر اسلامی ملک میں اشاعت اسلام کے کام میں ایسے روابط یقیناً بہت ہمت بڑھاتے ہیں۔ ••

ادارہ

جامعہ کے لیل و نہار

ششماہی امتحانات

جامعہ میں ششماہی امتحانات بالکل قریب آ گئے ہیں۔ یہ امتحانات ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء سے شروع ہو رہے ہیں اور ۳ نومبر ۱۹۸۸ء کو دوپہر میں ختم ہو رہے ہیں۔ اسی روز ظہر کے بعد طلبہ اپنے گھروں کو جا سکیں گے۔ ۲۰ نومبر کو تعطیل ختم ہو جائے گی اور ۲۱ نومبر کو مدرسہ کھل جائے گا۔ سبھی طلبہ کے لئے وقت پر حاضری لازمی ہوگی۔

جامعہ میں ایک اور بس

دور سے آنے والے چھوٹے طلبہ کی سہولت کے لئے ایک اور بس جامعہ میں آ گئی ہے۔ اس کا نمبر 2739 M.R.T ہے۔ اس طرح جامعہ میں دو بسیں آ گئی ہیں۔ ایک بس دھوبی پور، چاندپٹی وغیرہ سے طلبہ و طالبات کو لاتی اور لے جاتی ہے اور دوسری جیراج پور، بندول، علاؤ الدین پٹی، نصیر پور، گلوا کے بچوں کو لاتی اور لے جاتی ہے۔

جناب علی سیٹھ کی آمد

۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء کو گجرات کے جناب علی سیٹھ صاحب جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ آپ نے مدرسہ، جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری، مدرسہ کی لائبریری کو دیکھا اور بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ دونوں لائبریریوں کے لئے کتابوں کے تحفے بھیجتے رہیں گے۔ ہم نے ایسی کتابوں کی فہرست طلب کی جو لائبریری میں موجود نہیں ہیں اور جن کی سخت ضرورت ہے۔ "جماعت نو" کے طلبہ میں [illegible] خوشخط کا مظاہرہ کیا اور تعاون کا وعدہ کیا۔ آپ ہی نے دوسری بس "۲۷۳۹" جامعہ کو ہدیہ کیا ہے۔

سید شہاب الدین کی آمد

۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایک بجے دن میں "مسلم انڈیا" اردو اور انگریزی کے ایڈیٹر، مسلم پرسنل لا بورڈ اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ممبر جناب سید شہاب الدین صاحب جامعہ تشریف لائے اور طلبہ سے کچھ دیر گفتگو کی۔ آپ نے طلبہ سے کہا کہ آپ ہی امت کے مستقبل کے قائد ہیں۔ آپ کو صرف مسجد و منبر کی امامت نہیں کرنی ہے، اس لئے آپ محنت اور لگن سے علم حاصل کریں، تاکہ ملت کی رہنمائی میں آسانی ہو۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

۳۰/۷/۱۹۸۷ء کو اساتذہ کی نگرانی میں جمعیۃ الطلبہ کا تقریری مقابلہ ہوا پہلے سے عنوانات متعین کر دیئے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ عربی پنجم تا ہفتم۔ اوّل: ضیاء الدین ملک، محمد عثمان، دوم: عبد الصبور اثری، سوم: حبیب اللہ عمر۔ عربی چہارم: I: اخلاق احمد اعظمی۔ II: عبد الرحمٰن اعظمی، III: شاہد بدر اعظمی۔ عربی سوم: I: قیصر پرویز، II: عبد الغنی، III: الیاس احمد۔ عربی دوم: I: محمد شمشاد بجنوری، II: عطاء اللہ فہد، III: عارف حسین، عربی اول: I: مجاہد حسین دہلوی، II: عابد حسین دہلوی، III: نظام الدین۔

۱۷/۹/۱۹۸۷ء کو اساتذہ کی نگرانی میں تحریری مقابلہ ہوا۔ عربی پنجم تا ہفتم، I: ضیاء الدین ملک، II: عبد الصبور اثری، III: فیاض احمد مالیگانوی۔ عربی چہارم، I: شاہد بدر، II: محمد اشرف، محمد یسین شیخ، III: محمد ارشد۔ عربی سوم، I: عبد الرب اثری، II: محمد الیاس، III: محمد ادریس۔ عربی دوم، I: عطاء اللہ فہد، II: شمشاد حسین، عارف حسین، III: تنویر عالم۔ عربی اول، I: صداقت حسین، II: نظام الدین، III: طاہر ظفر۔

ثانوی اور ابتدائی کے نتائج تیار نہیں کئے جا سکے۔ انعام صرف ان لڑکوں کو ملے گا جن کا مجموعی نمبر زیادہ ہوگا۔ یہ نمبرات سال میں دو بار جوڑے جائیں گے اور انعامات بھی دو بار ہی تقسیم کئے جائیں گے۔

ذبیح کون؟

توریت میں مذکور ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے، اسی لئے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا کیونکہ اسمٰعیل دو لفظوں سے مرکب ہے "سمع" اور "ایل"۔ سمع کے معنی ہیں سننا اور ایل کے معنی ہیں خدا۔ اس کا مطلب ہوا کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی۔ پس اس آیت کریمہ کے مصداق حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں۔ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش حضرت اسمٰعیلؑ کے تیرہ سال بعد ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ کو اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا۔ پس حضرت اسحٰقؑ اپنے بڑے بھائی اسمٰعیلؑ کی موجودگی میں اکلوتے نہیں ہو سکتے۔ (اردو ڈائجسٹ)

عمر فاروقؓ

ہم کیا بیان کریں، جو فضیلت عمرؓ کی تھی
سیرت رسولِ پاکؐ کی، سیرت عمرؓ کی تھی

حاکم تھے، بے نظیر حکومت عمرؓ کی تھی
عادل تھے، بے مثال عدالت عمرؓ کی تھی

"ہوتے جو میرے بعد تو ہوتے نبی عمرؓ"
مدحت سرِ زبانِ نبوت عمرؓ کی تھی

تائید ان کی رائے کی وحیِ خدا نے کی
کیا حق شناس چشمِ بصیرت عمرؓ کی تھی

بڑھیا کو بھی یہ حق کہ سرِ بزم ٹوک دے
یہ دادگستری، یہ شرافت عمرؓ کی تھی

اُڑتے تھے ظلم و جہل کے ہوش ان کے نام سے
وہ دبدبہ، وہ رعب، وہ ہیبت عمرؓ کی تھی

باطل کے خرمنوں پہ گری، بن کے برقِ حق
کیا آب دار تیغِ جلالت عمرؓ کی تھی

روشن ہوئیں نظامِ شریعت کی خوبیاں
نصرت خدائے پاک کی، عزت عمرؓ کی تھی

کپڑا لباس، ان میں بھی پیوند جا بجا
لرزاں تھے شرق و غرب، یہ صولت عمرؓ کی تھی

شاہِ عرب بھی، فاتحِ ایران و روم بھی
نانِ جویں غذا، یہ معیشت عمرؓ کی تھی

دنیا کو آج بھی ہے ضرورت اُسی طرح
دنیا کو جیسے پہلے ضرورت عمرؓ کی تھی

فولاد بھی، حریر بھی، شعلہ بھی، برف بھی
زاہد! عجیب شان طبیعت عمرؓ کی تھی